﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّائِلِيْنَ﴾

تذکرہ

حضرت مولانا یوسف احمد صاحب کاوی رحمۃ اللہ علیہ

(ولادت: ۱۳۸۶ھ؍ ۱۹۶۷ء/ وفات: ۱۴۳۸ھ؍ ۲۰۱۷ء)

زیرِ سایۂ عاطفت

حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب سملکی دامت برکاتہم

(مہتمم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک)

کاوش

محمد اسامہ بن مظہر جھارکھنڈی

ناشر

شعبۂ تقریر و تحریر

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک

نوساری، گجرات (الہند)

تفصیلات

اسم کتاب:..........تذکرہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاویؒ

کاوش:..........................محمد اسامہ جھارکھنڈی

زیر سایۂ عاطفت:...حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب سملکی مدظلہ

سن طباعت:...........رجب المرجب ۱۴۳۸ھ اپریل ۲۰۱۷ء

صفحات:...................................۲۰۸

ناشر:...........شعبۂ تقریر وتحریر، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

فہرست مضامین

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
۱	کلمات بابرکت	۹
۲	غبار خاطر	۱۱
۳	تمہید	۲۰
	باب اول: حیات وخدمات	
۴	پیدائش ووطن	۲۷
۵	خاندانی حالات	۲۷
۶	لطیفہ	۲۸
۷	چیچک کا حملہ	۲۹
۸	تعلیم کی بسم اللہ	۳۰
۹	یہ مولانا ابراہیم کون ہیں؟	۳۰
۱۰	ایک مخلص رفیق کی وفات کا صدمہ	۳۱
۱۱	مولانا مرحوم کی دیگر خدمات	۳۳
۱۲	وعظ وتقریر	۳۳
۱۳	ذاتی تعلقات	۳۴
۱۴	تدفین	۳۶

۱۵	مکتب کے اساتذہ	۳۷
۱۶	جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں داخلہ	۳۷
۱۷	مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ اور اعلیٰ تعلیم	۳۹
۱۸	میدان تجوید میں	۴۱
۱۹	بیعت وسلوک اور تزکیۂ نفس	۴۲
۲۰	ازدواجی زندگی کا آغاز	۴۳
۲۱	اہلیہ محترمہ کا تعارف اور ان کی خدمات	۴۳
۲۲	دادی اماں کے حفظ کا واقعہ	۴۶
۲۳	اولاد واحفاد	۴۶
۲۴	مولانا کی خدمات	۵۳
۲۵	تدریسی خدمات	۵۴
۲۶	جامعہ ڈابھیل میں تشریف آوری	۵۵
۲۷	ڈابھیل میں تقرر کا سبب	۵۶
۲۸	دارالافتاء کے فتاویٰ کی تنقیح	۵۶
۲۹	تنقیح فتاویٰ میں آپ کا طریقۂ کار	۵۷
۳۰	نیابتاً تدریسی خدمات	۵۹
۳۱	مستقل مسند تدریس پر	۵۹
۳۲	خانقاہ کی باگ ڈور	۶۰

۳۳	تبلیغی خدمات اور سرگرمیاں	۶۱
۳۴	ناظم تعلیمات	۶۴
۳۵	امتحان ہال کی نظم ونسق کی بے نظیر خدمت	۶۷
۳۶	میدان تقریر وتحریر میں	۷۱
۳۷	عزائم کی سرپرستی	۷۵
۳۸	احساس ذمہ داری	۷۶
	باب دوم: اوصاف وکمالات	
۳۹	آپ کا سراپا	۸۱
۴۰	عبادات کی چند جھلکیاں	۸۱
۴۱	نماز سے متعلق آپ کی پابندی کا حال	۸۲
۴۲	وظائف کی پابندی	۸۳
۴۳	قرآن مجید سے لگاؤ	۸۴
۴۴	حجاز مقدس کا سفر	۸۵
۴۵	رمضان المبارک کے مسلسل چار عمروں میں آپ کی کیفیت	۸۶
۴۶	مولانا اور حرم	۸۷
۴۷	مولانا کی سحری وافطاری	۸۸
۴۸	حرم سے واپسی	۸۸
۴۹	طواف سے متعلق ایک عجیب واقعہ	۸۹

۵۰	والدین کے ساتھ برتاؤ	۹۰
۵۱	اپنی اولاد پر پدرانہ شفقت	۹۰
۵۲	مسنون دعاؤں کا اہتمام	۹۱
۵۳	دعا کرنے کا معمول	۹۳
	آپ کے درس کی جھلکیاں	
۵۴	درس کی پابندی	۹۵
۵۵	عطر اور خوشبو کا تذکرہ	۹۵
۵۶	قبل از درس مخصوص ادعیہ واذکار کا اہتمام	۹۵
۵۷	افہام وتفہیم کا سہل اور نرالا اسلوب	۹۷
۵۸	آپ کے ترجمہ کی عمدگی	۱۰۱
۵۹	اکابرین دیوبند وسہارن پور سے والہانہ عشق	۱۰۲
۶۰	ہمارے علمائے دیوبند بھی ایسے تھے	۱۰۳
۶۱	بلا کی ذہانت اور بے نظیر قوت حافظہ	۱۰۴
۶۲	ظرافت اور خوش مزاجی	۱۰۶
۶۳	طلبہ پر شفقت ومہربانی	۱۰۸
۶۴	امتحان کے موقع پر دعاؤں کے رقعے	۱۱۲
۶۵	دوران تدریس زبان درّبار سے نکلے ہوئے قیمتی موتی	۱۱۲
۶۶	حلم وبردباری کا پیکر	۱۲۰

۶۷	طلبہ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی	۱۲۲
۶۸	مہمانان رسول کی عظمت	۱۲۴
۶۹	قناعت پسندی و دنیا بیزاری	۱۲۵
۷۰	صبر و تحمل	۱۲۸
۷۱	تواضع وانکساری	۱۲۹
۷۲	طلبہ سے دعا کروانے کا عجیب معمول	۱۳۲
۷۳	اندازِ تربیت	۱۳۸
۷۴	فتنہ وفساد سے کنارہ کشی	۱۴۵
۷۵	صبر و استقامت اور اوقات کی پابندی	۱۴۵
۷۶	جامعہ سے بے انتہا عشق اور والہانہ لگاؤ	۱۴۸
۷۷	جود وسخا کا پیکر	۱۵۰
۷۸	احسان شناسی اور شکر گزاری	۱۵۲
۷۹	حدیث پڑھانے کی دعا	۱۵۳
۸۰	مستجاب الدعوات شخصیت	۱۵۵
۸۱	زندگی کے آخری چند ماہ مبارک	۱۵۸

باب سوم

آخری لمحات وفات وصیت تعزیتی خطوط اور خراج محبت وعقیدت

۸۲	ایک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا	۱۶۵

۸۳	تدفین کا ایک منظر	۱۶۶
۸۴	آپؒ کی دو وصیتیں	۱۶۹
۸۵	ڈابھیل میں دفن ہونے کی وجہ	۱۷۰
۸۶	آپ کے انتقال کے بعد شاگردوں کے مختلف خواب	۱۷۱
	تعزیت نامے	
۸۷	پیغام تعزیت از حضرت شیخ القراء دامت برکاتہم	۱۷۴
۸۸	پیغام تعزیت از حضرت مولانا محمد یوسف بھولا مدظلہ	۱۷۵
۸۹	پیغام تعزیت از حضرت مولانا محمد دھورات صاحب مدظلہ	۱۷۸
۹۰	تیرے غم میں ہر اک سوگوار ہے	۱۸۰
۹۱	یوسف سا دل ربا، معیار سادگی، علم کا چشمہ	۱۸۱
	محبت وعقیدت کا خراج	
۹۲	مرثیہ از معاذ کولہاپوری	۱۸۴
۹۳	مرثیہ از عمر اورنگ آبادی	۱۸۵
۹۴	ومضة من ومضات حياة الشيخ يوسف أحمد الكاوي عليه رحمة الله	۱۸۸

باسمہ تعالیٰ

کلماتِ بابرکت

حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم العالیہ

(معین مفتی دارالافتا جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات)

حمد وستائش اُس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا۔

اور

صلاۃ وسلام اُس کے آخری پیغمبر پر جنھوں دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

الحمدللہ! جامعہ کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے موجودہ مہتمم صاحب مدظلہم کی توجہ وبرکت سے مختلف مرحوم اساتذہ کی خدمات منظرِ عام پر آرہی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب حضرت مولانا یوسف صاحب کاویؒ کے تذکرے کے لیے مختص ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش سے وفات تک کے حالات کا یہ مرقَّع بڑی محنت اور جاں فشانی سے تیار کیا گیا ہے، جو مولاناؒ کے متعلقین اور شاگردوں کے لیے کسی یادگار تحفہ سے کم نہیں ہے۔

اِس کے مرتّب نے جو کچھ لکھا ہے، نقل کیا ہے، اُسے ایک شاگرد کے تأثرات کی حیثیت سے پڑھا جائے، نہ کہ استاذِ محترم کے جمیعِ اوصاف وکمالات کے پورے مرقّع کی حیثیت سے۔ مرتّب کا کمال ہے کہ اِس کتاب میں کئی اساتذہ

کی باتوں کو نگینے کی طرح برمحل اور برموقع جوڑ کر بزمِ یوسف کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اِس طرح کے تذکروں اور سوانحی خاکوں سے شخصیات زندہ رہتی ہیں اور عرصۂ دراز تک ان کے طور و طریق شائقین و محبین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں، جو درحقیقت تاریخِ جامعہ کا زرّیں باب ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفتی معاذ صاحب سلمہ (استاذِ جامعہ ڈابھیل، جو درحقیقت اِس کتاب کے روحِ رواں ہیں) اور مرتّبِ کتاب: مولوی محمد اسامہ جھارکھنڈی (متعلم: دورۂ حدیث شریف) کو خوب ترقیات سے مالا مال فرمائیں۔ اوّل الذکر موصوف جامعہ کے شعبۂ تقریر و تحریر یعنی (رجال کار) کے اسٹیج سے متعدد طلبہ کو صاحبِ قلم بنانے کی مساعئ جمیلہ کر رہے ہیں، یہ تذکرہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر دو موصوف کی خدمت کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر مزید خدماتِ علمیّہ و دینیّہ کے لیے موفّق فرمائے، آمین۔

احقر: العبد عبد القیوم راجکوٹی

معین مفتی دار الافتا جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات

۲۱/رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

مطابق: ۲۰/اپریل ۲۰۱۷ء بروز: جمعرات، قبیلِ عصر

باسمہ تعالیٰ

غبارِ خاطر

سَن تو یاد نہیں؛ لیکن اِتنا ضرور یاد ہے کہ راقم کوئی بارہ تیرہ برس کا چھوٹا سا لڑکا ہوگا، جب شہر کی ظلمت بھری، مادّیت کی ماری فضا سے نکل کر روحانیت کے گلشن، علم وعرفاں کی جنت: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں بہ غرضِ تعلیم داخل ہوا۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہمیشہ ایک وجیہ، بھاری بھرکم شخصیت کو چہرے پر چیچک کے داغ، سینے پر پھیلی ڈاڑھی، چوڑی پیشانی، عینک سے ڈھکی ہوئی آنکھیں اور ایک خاص مستانہ ادا کے ساتھ آتے جاتے دیکھتا رہا۔ بے شعوری کے زمانے کو کیا کہیے! ذہن ہمیشہ اس سادگی کے پیکر کو ''ایک بے ضرور دیہاتی'' سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا، وقت پَر لگا کر اُڑتا رہا اور جامعہ کی پُرنور و بارونق فضا میں عقل وخرد پروان چڑھتے رہے۔ اِس دوران جہالت کے پردے اُٹھتے رہے اور رفتہ رفتہ ''بے ضرر دیہاتی'' کا لاشعوری رُعب اور اس کی عظمت وعقیدت کا سکّہ قلب پر جمتا گیا۔

عربی چہارم کے سال ''ریاض الصالحین'' کھول کر اُسی شخصیت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا طے پایا، جس کو ناواقفیت کے خول میں بند، چھوٹے سے دِماغ نے کسی زمانے میں ایک ''دیہاتی'' باوَر کر رکھا تھا۔ شخصیت کی پَرتیں کھلتی گئیں اور قلب ودِماغ کی سلطنت علم وفن اور تحقیق وجستجو کے اس بحرِ بے کراں کے

سامنے جھکتے جھکتے بالآخر سجدہ ریز ہوگئی اور اَب وہی ''دیہاتی''، مشفق ومربی، محسن وکرم فرما ''حضرت اقدس مولانا یوسف صاحب کاوی'' کی شخصیت میں ڈھلا سرمۂ بصیرت وبصارت بنا ہوا تھا، جس کی ادائیں دیکھ کر بے اختیار فدا ہونے کو جی چاہتا تھا، جس کی باتیں سن کر عقل وخرد، قلب ودماغ اور روح وجسد وَجد وطرب میں جھوم اُٹھتے تھے، جس کی شفقتوں کے سائبان تلے مسافرانِ علم وآگہی سیراب ہوکر چست ونشیط آگے کو گذر جاتے، شہد میں ڈوبا ہوا جس کا شیریں لہجہ پھڑکائے دیتا تھا اور جس کے لطیف اشارے تڑپائے دیتے تھے؛ غرض یہ کہ اُس کا ہر ہر عمل، ہر ہر قول اور اس کی ہر ہر چیز بھلائے نہ بھولتی تھی:

بلائے جاں ہے غالبؔ! اُس کی ہر بات		عبارت کیا، اِشارت کیا، ادا کیا

پھر جب اوصاف وکمالات پر نظر پڑتی تھی، تو تواضع وانکساری، استغنا وبے نیازی اور زہد وسادگی کا مجسم پیکر محسوس ہوتا تھا۔ راقم کو- بہ فضلِ الٰہی- اپنی لاکھ نااہلیت کے باوجود اپنے اساتذۂ ذی شان سے استفادے کی سعادت میسّر آئی، ہر ایک کو اوصافِ حمیدہ واخلاقِ حسنہ سے آراستہ پایا؛ لیکن سادگی وبے نفسی کی جو صفت جس درجہ میں حضرت مولاناؒ کی ذاتِ ستودہ صفات میں دیکھی، کم ہی کوئی اُس کا ہم پلہ نظر آیا:

سبھی اندازِ حُسن پیارے ہیں		مگر ہم تو سادگی کے مارے ہیں

دنیا سے بے رغبتی، زہد واستغنا اور قناعت پسندی حضرت مولاناؒ کا طرۂ

امتیاز تھا۔آپؒ کے پاس چند ساعت بیٹھنے والا جب اُٹھتا تو یہ گواہی دیتے ہوئے اُٹھتا تھا کہ:

خاکی و نوری نہاد، بندۂ عالی صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

حضرت مولاناؒ کی جس اَدا کا آج بھی دل پر سکّہ بیٹھا ہوا ہے، وہ ہے آپؒ کا دورانِ درس اکابرین کے حالات سنا کر طالبانِ علومِ نبوت کی تربیت وذہن سازی کرنا۔راقم کو اِس کا اعتراف ہے کہ ایک عمر تک باوجود ''دعوتی پس منظر'' رکھنے کے دعوت وتبلیغ سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی؛لیکن حضرت مولاناؒ کے اسباق میں تبلیغ کے اکابرینِ ثلاثہ:حضرت مولانا عمر صاحب پالن پوریؒ،حضرت مفتی زین العابدین صاحبؒ،حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاویؒ وغیرہ اکابر کی خدمات،قربانیوں اور عظمتوں کے جو نقوش صفحۂ قلب پر ثبت ہوئے،وہ آج تک تازہ ہیں۔

حضرت مولاناؒ جس انداز میں ان کی ناقابلِ فراموش خدمات، ان کے ایمان افروز وولولہ انگیز خطبات اوران کی بے پناہ جاں فشانیاں سناتے تھے،اس سے دل پر ایک چرکا سا لگتا تھا،ان کی زندگیاں اور امت کے حالات سنا کر طلبہ کی ذہن سازی فرماتے۔آج جامعہ میں تبلیغ کی جو بھی چہل پہل نظر آتی ہے،اس کا سہرا مولانا مرحوم کے سر بندھتا ہے۔اس مؤثّر اور رقّت آمیز گفتگو میں بہت بڑا دخل

مولاناؒ کے دلِ دردمند کو رہا، ٹوٹے ہوئے دل اور تڑپتے ہوئے قلب سے جب اُمت کی زبوں حالی و بے دینی کی داستان سناتے تو سنگ دل سے سنگ دل اپنی ذات پر غور کرنا شروع کردیتا اور لاشعوری طور پر طالبِ علم کا ذہن بنتا جاتا۔ آج تبلیغ کا کام کرنے والے اور دعوت کے لیے پوری عمر کھپا دینے والے اَجساد کی کمی نہیں، کمی اُن تڑپتی روحوں اور بے چین و مضطرب قلوب کی ہے، جن کی سادہ سی بات سن کر کوئی پکار اُٹھے:

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

حضرت مولاناؒ کی ایک اہم خصوصیت اپنے طلبہ پر شفقت اور ان کی حوصلہ افزائی ہے۔ راقم کو اِس کا بے پناہ اندازہ اُس وقت ہوا جب چھوٹے بچوں کے لیے قلمی جداریہ ''عزائم'' کا اِجرا ہوا اور حضرت مولاناؒ اس کے سرپرست قرار پائے، مولاناؒ کی سرپرستی میں ''عزائم'' پھلا، پھولا، اسے ترقی نصیب ہوئی، ننھے منے بچوں میں مضمون نگاری کے عزائم بیدار ہوئے اور لکھنے کی ایک عمومی فضا تیار ہوئی۔ راقم کو بہ حیثیت ''عزائم'' کے خادم ہونے کے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ: اگر آپؒ کی حوصلہ افزائیوں اور مستجاب دعاؤں کا سہارا نہ ہوتا تو عزائم کب سے خاک میں مل کر فسانہ ہو چکے ہوتے۔ سچ ہے:

ٹھہرے تو گردشِ کائنات ٹھہر گئی		گذرے تو رہ گزارِ محبت سجا گئے

زندگی، موت کا مقدمہ ہے، جو اِس دنیا میں آیا ہے اُسے ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ حضرت مولاناؒ بھی اپنے وقتِ مقررہ پر چپکے سے چلے گئے؛ لیکن جس صبحِ الم ناک میں ان کے فراق وجدائی کا صدمہ جھیلنا پڑا اور جب ان کی وفاتِ حسرت آیات کی خبرِ جاں گداز پردۂ سماعت سے ٹکرائی، ایسا لگا کہ ہم تپتے صحرا کی جھلستی دھوپ میں ایک سائبان سے محروم ہو گئے۔

وہ ہاتھ نہ رہے جو ہمارے لیے اُٹھتے تھے، وہ زبان نہ رہی جو حوصلہ افزائی کے لیے کھلتی تھی، وہ دل نہ رہا جو ہمارے لیے تڑپتا تھا، وہ ذات نہ رہی جس کے سائے میں بیٹھ کر زمانے کے سارے غم بھول جاتے تھے؛ گویا کسی معصوم سے بچے کا شفیق باپ اچانک وفات پا گیا ہو۔

میں منہ چھپا کے رویا ہوں رات بھر
گذرا ہے زندگی سے میرا باپ ابھی ابھی

عرصہ ہوا ایک شعر سن رکھا تھا؛ مگر اُس کو حقیقت کے سانچے میں ڈھلتا ہوا اُس روز دیکھا جب آپؒ ہزاروں شاگردوں وخوشہ چینوں کو سوگوار چھوڑ کر بہت دور اپنے رب کے حضور جا پہنچے:

حالِ ما در ہجرِ ''یوسف'' کم تر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود، ما پدر گم کردہ ایم

نصیر الدین نصیرؔ کی مندرجۂ ذیل غزل جب آنکھوں کے سامنے سے

گذری تو ایسا لگا کہ اس کا ہر ہر شعر، ہر ہر مصرع؛ بلکہ ہر ہر لفظ و حرف استاذ کے سانحۂ ارتحال اور ہم پس ماندگان کی حالت زار بیان کرر ہا ہے:

سنے گا کون قصۂ دردِ دل، میرا غمگسار چلا گیا
جسے آشناؤں کا پاس تھا، وہ وفا شعار چلا گیا
وہی بزم ہے، وہی دھوم ہے، وہی عاشقوں کا ہجوم ہے
ہے کمی تو بس میرے چاند کی، جو تہِ مزار چلا گیا
وہ سخن شناس، وہ دور بیں، وہ گدا نواز، وہ مہ جبیں
وہ حسیں، وہ بحرِ علومِ دیں، میرا تاجدار چلا گیا
کہاں اب سخن میں وہ گرمیاں کہ نہیں رہا کوئی قدرداں
کہاں اب وہ شوق میں مستیاں کہ وہ پُر وقار چلا گیا
جسے میں سناتا تھا دردِ دل، وہ جو پوچھتا تھا غمِ دروں
وہ گدا نواز بچھڑ گیا، وہ عطا شعار چلا گیا
بہیں کیوں نصیؔر نہ اشکِ غم، رہے کیوں نہ لب پر میرے فغاں
ہمیں بے قرار وہ چھوڑ کر سرِ راہ گذر چلا گیا

آج ''شعبۂ تقریر وتحریر'' اپنے اسی روحانی باپ کی حیات وخدمات کی ایک جھلک دکھلانے جارہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب 'تذکرہ حضرت مولانا یوسف احمد صاحب کاویؒ' حضرت مولاناؒ کی حیات وخدمات پر مشتمل ہے، جسے عزیزی القدر

محمد اسامہ سلّمہ نے بڑی محنت و عرق ریزی سے تیار کیا ہے۔ عزیز موصوف زبان وقلم کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں، ''الدین'' کے متحرک، فعّال اور ممتاز قلم کاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے، ان کے مقالے و مضامین ''الدین'' کی سالانہ اشاعتوں کی رونق بنتے رہتے ہیں۔ امسال انھوں نے ''الدین'' کی ادارت کے فرائض بھی نہایت اہتمام سے بہ حسن و خوبی انجام دیے، ''الدین'' سے جہاں انھوں نے بہت کچھ سیکھا وہیں بہت کچھ سکھلایا بھی، ایک طبقے نے ان کی ذات سے استفادہ کیا، درسیات میں ہمیشہ ممتاز پوزیشن لاتے رہے، عربی زبان وادب سے بھی خصوصی شغف ولگاؤ ہے، جس کا منہ بولتا ثبوت اسی کتاب میں شامل ان کا عربی مضمون ہے، خدا کرے کہ ان کا یہ متحرک قلم ہمیشہ چلتا رہے، اور ان کا یہ ''نقشِ اول'' دوسرے ''نقوش'' کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔ آمین

حضرت مولاناؒ کے شاگردوں اور خوشہ چینوں کی جانب سے راقم اپنے اِس عزیز کو قلبی تہنیت و مبارکبادی پیش کرتا ہے، کہ اَدبی انداز میں مولانا مرحوم کی خدمات کو کامیاب خَراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کی یادوں کو دلوں میں بسانے اور جمانے کا ایک مضبوط سہارا فراہم کر دیا ہے۔ اب جو ''سینے کے داغوں'' کو تازہ رکھنا چاہتا ہے، وہ اِس کتاب کو پڑھتا رہے اور مولانا مرحوم کے متعلق لکھے گئے نقوش کو نفوس میں اتار کر زندۂ جاوید رکھے۔

اس موقع سے راقم آثم حضرت اقدس مفتی عباس صاحب بسم اللہ ڈابھیلی

دامت برکاتہم کا شکر گزار رہے، کہ انھوں نے اس کتاب کے اکثر حصے کو سن کر مفید مشوروں سے نوازا۔

استاذی الشفیق مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم کا بھی بے حد ممنون و مشکور رہوں، کہ مولانا مرحوم کے متعلق آپ کے مرتب کردہ مضمون سے ہم نے اس کتاب کی ترتیب کے لیے بھرپور استفادہ کیا، کہنا چاہیے کہ آپ کا مضمون زمین کی حیثیت رکھتا تھا، عزیزم اسامہ سلمہ نے بیج ڈال کر اپنے خونِ جگر سے سینچا، اور یوں مولانا مرحوم کی حیات وخدمات پر مشتمل یہ چمن لہلہا اٹھا؛ نیز آپ نے اس کتاب پر از اول تا آخر نظر ڈال کر ناگزیر اصلاحات فرمانے کے ساتھ قیمتی رہنمائیوں سے بھی نوازا اور گراں بار مصروفیات کے باوجود حوصلہ افزا کلماتِ بابرکت لکھ کر عنایت فرمائے۔

مہتممِ جامعہ حضرت اقدس مولانا احمد صاحب بزرگ دامت برکاتہم کا بھی بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ حضرت کی توجہات وعنایات قدم بہ قدم شاملِ حال رہیں۔

اِن کے علاوہ استاذِ محترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت مفتی خلیل احمد صاحب کاوی مدظلہ (شیخ الحدیث جامعہ نقیب الاسلام کاوی) کا بھی منّت شناس ہوں، کہ جمعِ مواد سے لے کر طباعت تک کے مراحل میں بھرپور تعاون فرمایا۔

نیز اپنے دیرینہ محسن، تمام ہی کاموں میں ہم خُردوں کے سر پر ہاتھ رکھنے والے استاذی المکرّم حضرت مفتی ابوبکر صاحب پٹنی مدظلہ العالی کو کیسے بھول سکتا ہوں! کہ شروع دن سے لے کر اخیر دن تک ان کی شفقتیں برابر میسر آتی رہیں۔

اللہ تعالیٰ ان تمام کو اپنی شایان شان دارین میں بہترین بدلہ نصیب فرما کر ان کا سایۂ عاطفت ہم پر تا دیر قائم ودائم رکھے، اور صاحبِ تذکرہ کی ظاہری وباطنی خوبیاں ہم تمام کے اندر پیدا فرمائے۔آمین یارب العالمین

دعا گوو جو:

معاذ عبدالرزاق چارولیہ

خادم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

۲۵؍رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

بروز: یکشنبہ، شب: ۱۱ بجے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ، مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللهِ الأَمِينِ، وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ. أَمَّا بَعْدُ!

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّائِلِيْنَ﴾

کیا سناؤں تم کو اپنے درد و غم کی داستاں
کیا دِکھاؤں تم کو اپنے دل کی اُجڑی بستیاں
ختم ہے آنسو؛ مگر مجھ کو قرار آتا نہیں
زخم بھر جاتے تو ہیں؛ لیکن نشاں جاتا نہیں
حسرت آگیں ہے کہانی جامعہ ڈابھیل کی
مٹ گئی خاص ایک نشانی جامعہ ڈابھیل کی

ویسے تو شروع ہونے والے ہر نئے سال کا آفتاب-ضمناً و اشارتاً-ہمیں یہ پیغام دے کر طلوع ہوتا ہے کہ: دیکھ! تیری زندگی کا ایک سال کم ہو گیا ہے اور اب تُو اپنی قائم ہونے والی انفرادی قیامت سے ایک منزل اور قریب ہو چکا ہے۔ اب تک تُو غفلت کی نیند سوتا رہا، اب بیدار ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اُٹھ! اور اپنی منزل کے لیے کچھ متاعِ سفر اور زادِ راہ ساتھ لے لے۔ مگر قلم ڈگمگا رہا ہے اور صفحہ تھر تھرا رہا ہے یہ لکھنے سے کہ: سن دو ہزار ''سترہ'' کا نیا سال ہمارے لیے

''خطرہ''بن کر نمودار ہوا اور ہمارے خوابِ خرگوش پر ایک زوردار کچوکا لگا گیا۔

غزالاں! تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پر کیا گذری

یقیناً یک شنبہ کی پَو پھٹنے سے پہلے سحر کے سُہانے وقت میں ایک روح فرسا خبرِ وفات مجھ پر بجلی بن کر گری، اُس وقت میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں؛ لیکن اِس خبرِ وحشت اثر کو سنتے ہی نیند یکسر کافور ہوگئی۔ کوئی کہنے والا میرے کمرے میں آکر کہہ رہا تھا کہ: ''دورے والو! جلدی اٹھو! مولانا یوسف صاحبؒ کا انتقال ہوگیا ہے''۔

واللہ! اِس خبرِ وحشت اثر کو اچانک اور بغیر کسی ذہنی آمادگی کے سن کر دل دَھک سے رہ گیا، استعجاب اور غم واندوہ کے ملے جلے جذبات کے درمیان کچھ دیر کے لیے ہکّا بکّا سا رہ گیا اور دل میں یہ معصوم خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ کوئی اور ''یوسف'' ہو!۔ مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا، میں نے اطلاع دینے والے ساتھی سے پوچھا: ''کون مولانا یوسف؟ ....مولانا یوسف کاوی؟؟'' جب اِثبات میں جواب ملا تو میں نے ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' کا سہارا لے کر اپنے دل کو تسلی دی کہ اب اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہوسکتا ہے: ''قَدَّرَ اللّٰهُ مَا شَاءَ''.

کون سا جھونکا بجھا دے گا کسے معلوم؟
زندگی کی شمع روشن ہے ہَوا کے سامنے

اس کے بعد کیا ہوا؟

کوہِ غم ٹوٹ پڑے دیدہ و دل پر کتنے
قافلے درد کے آئے ہیں برابر کتنے

میرے ہم سفر قارئین! یہ دنیا جائے فانی ہے، اور مسافرانِ آخرت کی سرائے، جو آیا ہے وہ جانے ہی کے لیے آیا ہے اور کچھ پتہ نہیں کس کو کب جانا پڑے؟ صرف سابق اور لاحق کا فرق ہے:

اجل کے ہاتھ کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے؟

حضرت الاستاذ مولانا یوسف احمد کاویؒ کے سانحۂ ارتحال پر صرف میں ہی نہیں؛ بلکہ مجھ جیسے ہزاروں بادہ خوارانِ مے کدۂ یوسفی کو بھی ''یُتم'' کی تلخیوں کا بامعنیٰ اِدراک ہوا ہوگا:

آنکھوں میں بس کے، دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی، جگا کر چلے گئے

اور روحِ غالبؔ سے معذرت کے ساتھ قدر شناسانِ ''یوسف'' ذرا یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عِشق سیہ پوش ہوا ''تیرے'' بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صَلا "تیرے" بعد

یوں تو اِس عالَمِ رنگ و بُو میں انسانوں کے بے شمار قافلے آتے جاتے رہتے ہیں، لوگ آتے گئے اور وقتِ محدود گذار کر چلے گئے اور گئے تو ایسے کہ: "داستاں تک باقی نہ رہی داستانوں میں" زمانہ اُنھیں بھول گیا؛ لیکن کچھ اَنفاسِ قدسیہ اور نیک فطرت بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اِس خاکی مسافر خانے سے الوداع ہوتے ہیں، تو اپنے پیچھے دسیوں نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں، بیسیوں درسِ عبرت دے جاتے ہیں اور سینکڑوں زندگی کے رہنما اصول سِکھا جاتے ہیں۔

بہت سے احساسات وجذبات ایسے ہوتے ہیں جن کی صحیح تعبیر کے لیے انسان اپنی تمام تر نثری، شعری وادبی صلاحیتوں کے باوجود صحیح الفاظ ڈھونڈنے میں ناکام رہتا ہے اور لگتا ایسا ہے کہ الفاظ کے سارے خزانوں میں اُن کی ترجمانی کے لیے کوئی موزوں لفظ موجود ہی نہیں ہے۔ حضرت الاستاذؒ کی وفات کی خبر سن کر میں اسی طرح کے احساسات وجذبات سے دوچار رہا اور اب تک ہوں۔

گو "جذبات کی موجوں میں لفظوں کی زباں گم ہے" مگر اپنے دل کو تھامتے ہوئے غیر موزوں الفاظ کی لڑیوں میں ہی سہی؛ استاذِ محترم کی زندگی کے کچھ انمٹ نقوش اور نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کررہا ہوں؛ ورنہ "مضمون جو سوچا تھا کیا جانے کہاں گم ہے؟" اور "آنکھوں میں بھی اَشکوں کا

اَب نام ونشاں گم ہے''۔

زندگی کا زندگی سے فاصلہ رہ جائے گا
صورتیں کھو جائیں گی، بس آئینہ رہ جائے گا
تم چلے بھی جاؤ گے؛ لیکن تمہاری یاد کا
دور تک پھیلا ہوا اک سلسلہ رہ جائے گا

بابِ اول

حیات و خدمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیدائش ووطن

خطۂ گجرات میں شہر بھروچ کے ساحلی علاقے پر واقع ''کاوی'' نامی ایک گاؤں آباد ہے، جو کسی زمانے میں بندرگاہ رہنے کی وجہ سے تجارت ومعیشت کی دنیا میں ایک زرّیں علاقہ رہا ہے اور جہاں کی زرخیز سرزمین نے اپنے بطن سے بہت سے آب دار موتی نکال کر دنیا کو دیے۔ اسی گاؤں نے ۹/ جمادی الثانی ۱۳۶۶ھ مطابق: یکم مئی ۱۹۴۷ء بہ روزِ پنج شنبہ: استاذ الاساتذہ حضرت مولانا یوسف بن احمد کاوی -نور اللہ مرقدہٗ- جیسے درِّ خوش آب کو جنم دیا۔

خاندانی حالات

مولاناؒ کا خاندان ابتدا میں دکان وغیرہ کاروبار کی وجہ سے خوش حال سمجھا جاتا تھا؛ لیکن بعد میں کچھ ایسے ناگفتہ بہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے آپؒ کے والدِ محترم: حاجی احمد بھائی بہت ہی زیادہ مقروض ہو گئے، جس کا اثر کاروبار پر پڑنا ایک یقینی امر تھا۔ مولاناؒ کے تایا: حضرت مولانا ابراہیم صاحب کاویؒ (جو دارالعلوم کنتھاریہ کے اولین مدرسین میں سے ہیں) نے ان قرضوں کو ختم کرنے کے لیے سارا اَثاثہ اور کُل جائیداد قرض خواہوں کی نذر کر دی؛ حتی کہ وہ چھوٹی سی دُکان جس سے گھر کا گذران چلتا تھا اُسے بھی فروخت کرنا پڑا۔ اور اِس طرح قرضے کے بوجھ سے سر ہلکا تو ہو گیا؛ مگر چوں کہ سارا کاروبار ختم ہو چکا تھا، اس لیے

پورا گھرانہ نہتّا ہوگیا، کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہ رہا اور فاقے پر فاقے پڑنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جامعہ ڈابھیل کے ''اہتمام'' کا انتظام وانصرام حضرت مولانا عبدالحی بسم اللہ ڈابھیلیؒ سے منتقل ہوکر حضرت مولانا محمد سعید بزرگؒ کے ہاتھوں میں آیا تھا۔ مولاناؒ کے تایا حضرت مولانا ابراہیم صاحب کاویؒ کا مولانا محمد سعید صاحب بزرگؒ کے ساتھ بڑا گہرا تعلّق تھا اور دونوں ایک دوسرے کے ہم درس بھی تھے، اُنھوں نے مولانا محمد سعید صاحب بزرگؒ سے درخواست کی کہ: آپ اپنے جامعہ میں میرے چھوٹے بھائی ''احمد'' کو کسی خدمت کے لیے رکھ لیجیے، بڑی مہربانی ہوگی!۔ مولانا سعید بزرگؒ کو اللہ تعالیٰ نے چوں کہ غیر معمولی فِراست سے نوازا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص کاروباری لائن کا آدمی ہے، بایں وجہ حساب کتاب کے تعلق سے نظم ونسق میں اچھی خاصی مہارت ولیاقت ہوگی؛ اس لیے مولانا مرحوم کے والد صاحب جناب احمدؒ کا جامعہ کے مطبخ کی نظامت کے لیے تقرُّر کردیا۔ اس کے بعد وہ اپنے بال بچوں سمیت پورے گھرانے کو لے کر یہاں ڈابھیل سملک میں آکر بَس گئے اور تقریباً چار سال ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک جامعہ میں رہ کر مطبخ کی نظامت کے فرائض بہ حُسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

لطیفہ

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے ایک مرتبہ درس

میں فرمایا کہ: مولانا یوسف صاحبؒ کے والد حاجی احمد صاحبؒ کی ''ویسما'' میں کسی عالم صاحب سے بحث ہوگئی۔ بحث کے دوران اُس عالم صاحب نے کہا کہ: میں ''مولوی'' ہوں۔ اِس پر حاجی صاحبؒ نے برجستہ کہا کہ: مَیں ''مولوی کا باپ'' ہوں۔ یہ سن کر وہ عالم صاحب چونک گئے اور سوچا کہ اِن سے بحث نہ کرنے ہی میں خیریت ہے۔ بعد میں جب اُن عالم صاحب کو پتہ چلا کہ یہ تو خود ''مولوی'' نہیں ہیں؛ بلکہ اُن کے دو صاحب زادے مولوی ہیں جن میں سے ایک جامعہ میں پڑھاتے ہیں، تو اُن کو حاجی صاحب کی حاضر جوابی پر بڑی حیرانی ہوئی۔

اِسی واقعے کو حضرت مفتی فرید صاحب کاوی مدظلہ نے کچھ اِس طرح بیان فرمایا ہے:

''ڈابھیل کے دو آدمی کسی مسئلے میں اختلافی گفتگو کر رہے تھے، اس درمیان وہاں سے ''ڈایا سیٹھ'' (مولاناؒ کے والد: حاجی احمد صاحب) گذرے تو انہوں نے پوچھا کہ: بھائی! کیا مسئلہ ہے؟ ان دونوں میں سے کسی نے جواب دیا کہ: پٹیل صاحب! ہم مولوی صاحب سے رجوع کرلیں گے، یہ مسئلہ آپ کے بس کا نہیں۔ یہ سن کر ڈایا سیٹھ کہنے لگے: واہ بھائی! تم مولوی کی بات کرتے ہو؟ میں تو دو مولویوں کا باپ ہوں۔ بھلا کیوں نہیں بتلاسکتا۔

چیچک کا حملہ

تقریباً تیرہ سال کی عمر میں آپؒ کو چیچک کی بیماری ہوئی۔ اس سے پہلے

آپؒ کا چہرہ بہت ہی حسین وخوب صورت تھا، چیچک کے اَثرات زندگی کے آخری دنوں تک ہمیں دیکھنے کو ملے اوراسی وقت آپ کو آنکھ میں ایک سِری (پھنسی) ہوئی تھی جو آنکھ میں پھوٹ گئی جس کی وجہ سے ایک آنکھ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ایک ہی آنکھ سے آپؒ نے اپنی پوری طلبِ علمی کی زندگی اور تدریسی زندگی انتہائی صابرانہ وشاکرانہ انداز میں گزاردی، کبھی کسی کے سامنے اس کا شکوہ تک نہیں کیا۔

تعلیم کی بسم اللہ

مولاناؒ مرحوم کی تعلیم کا سلسلہ اپنے آبائی وطن: کاوی ہی سے ہو چکا تھا۔ چناں چہ آپؒ نے اپنے وطن ہی میں رہ کر ناظرۂ قرآن کریم، اردو دینیات، تعلیم الاسلام، اللہ کے رسول اور دینی تعلیم کا رِسالہ (۱۱ر حصے) جیسی کچھ ابتدائی بنیادی کتابیں پڑھیں۔

نیز عام ماحول کے مطابق دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دُنیوی تعلیم بھی چھٹی کلاس تک حاصل کی۔اس کے بعد اپنے تایا حضرت مولانا ابراہیم صاحبؒ کے ساتھ ''دارالعلوم کنتھاریہ'' تشریف لے گئے اور کچھ مدت وہاں تعلیم وتربیت پائی۔

یہ مولانا ابراہیم کاوی کون ہیں؟

مولانا ابراہیم صاحب کاویؒ کا شمار دارالعلوم کنتھاریہ کے جلیل القدر مدرسین میں ہوتا تھا، ان کی وفات اس دیار کے لوگوں کے لیے کسی عظیم صدمے سے کم نہ تھی، چوں کہ استاذِ محترم مولانا یوسف صاحب کاویؒ کی تعمیر وتربیت میں اِن

کا بڑا کردار رہا ہے، از اوّل تا آخر ان کی رہبری، مشورے اور فہمائش قدم بہ قدم ساتھ رہی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِن کا تعارف بھی ہدیۂ ناظرین کر دیا جائے، کہ پھل کی عمدگی میں درخت کی تاثیر کو بڑا دخل رہا ہے۔ مندرجۂ ذیل مضمون مولانا ابراہیم صاحبؒ کی وفات پر ان کے رفیق و دوست منشی عیسیٰ صاحب کاویؒ نے گجراتی زبان میں لکھا تھا، جس کو اردو کا جامہ پہنانے والے ہمارے کرم فرما مفتی فرید صاحب کاوی مدظلہم (استاذِ جامعہ علوم القرآن جمبوسر) ہیں، ہم آں محترم کے شکریے کے ساتھ اسے بعینہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

ایک مخلص رفیق کی وفات کا صدمہ

آہ! مولانا ابراہیم صاحب۔ نور اللہ مرقدہ

عمر بھر حسن عمل تیرا بھلا سکتے نہیں
داغ تیری یاد کا دل سے مٹا سکتے نہیں

مولاناؒ کاوی، ضلع: بھروچ کے باشندے اور ضلع بھروچ میں آباد ''وہورا پٹیل'' برادری میں عالم وفاضل کے شرف سے مشرف ہونے والے اولین علمائے کرام میں بھی ممتاز شخص تھے۔ مؤرخہ: ۲۱ر فروری ۱۹۷۷ء سے ۴ر مارچ تک، فقط بارہ دن کا سخت مرضِ وفات جھیل کر مؤرخہ: ۵ر مارچ کا سورج طلوع ہوا اس سے پہلے اپنے متعلقین، محبین اور احباب کو داغِ مفارقت دے کر اور مبتلائے غم و گریہ چھوڑ کر رحمتِ خداوندی میں پہنچ گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

بہ وقتِ وفات آپؒ کی عمر فقط ۵۸ سال تھی۔

۵۹۔۱۳۱۷ھ میں آپؒ ڈابھیل سے فارغ ہوئے، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ نے اپنے مبارک ہاتھوں آپؒ کو سندِ عالمیت سے سرفراز فرمایا تھا۔ جامعہ اسلامیہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا محمد سعید بزرگ صاحب آپ کے ہم عمر، ہم سبق اور حصولِ سند میں بھی آپ کے رفیق وہمدم تھے۔ اور اُس وقت سے لے کر تا ایں دم؛ اِن دوستوں کے تعلقات سگے بھائیوں جیسے ہی رہے؛ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سعید بزرگ صاحبؒ اپنے اس پچاس سالہ مخلص رفیق ومشیر، ہمدردو جاں نثار محبّ کے فراق میں انتہائی حزین وغمگین ہو گئے ہیں۔ اللہ رب العزت صبرِ جمیل سے نوازے۔

حضرت مولاناؒ فراغت کے بعد "تخصص فی التفسیر" کے لیے حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس اللہ سرہ کی خدمت میں لاہور بھی گئے تھے اور ان سے فیض یاب ہوکر وطن واپس ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اولاً مادرِ علمی جامعہ ڈابھیل میں درجۂ عربی سے تدریس شروع فرمائی، اس کے بعد دیولا، وہالو اور کنتھاریہ وغیرہ قصبات کے مکاتب میں ابتدائی دینی تعلیم کی خدمات انجام دیں، کنتھاریہ کے مکتب میں تقریباً بیس-بائیس سال خدمات انجام دیتے رہے اور پھر جب دار العلوم کا قیام عمل میں آیا تو اس سے بہ حیثیت مدرّس منسلک ہوئے اور زندگی کے آخری لمحات تک

آخری آٹھ سال فارسی و عربی کتب کی تدریسی خدمات میں مشغول رہے۔

کنتھاریہ مکتب کی تعلیمی خدمات کے زمانے میں حضرت مولانا سعید بزرگ صاحب بہترین حق الخدمت کے ساتھ درجاتِ علیا کی تدریس کے لیے بہ اصرار دعوت دیتے رہے، مگر آپؒ نے دل و جان سے کنتھاریہ کو اپنا وطن بنالیا تھا، اس لیے انکار فرماتے رہے۔

مولانا مرحوم کی دیگر خدمات

آپؒ نے تقریباً ۳۵/سال جمعیت علماء ضلع بھروچ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے قومی خدمات انجام دیں۔ یہ وہ دور تھا جب پورے گجرات میں جمعیت علماء کا وجود تک نہ تھا، آپ مختلف پرچوں میں ان کی خدمات کا تعارف و تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ آزادی کے بعد گجرات میں جمعیت علماء صوبہ گجرات کے قیام سے لے کر تا حیات جمعیت کی عاملہ کے رکن بھی رہے، علاوہ اس کے کبھی نائب صدر اور کبھی جوائنٹ سیکریٹری کی ذمہ داری بھی ادا فرماتے رہے، اسی طرح مرکزی جمعیت کی کونسل کے رکن کے طور پر بھی منتخب ہوتے رہے۔

وعظ وتقریر

ضلع بھروچ میں شاید ہی کوئی قصبہ اور دیہات باقی ہو، جہاں آپؒ وعظ و تقریر کے لیے نہ پہنچے ہوں، آپؒ کا خطاب انتہائی اثر انگیز ہوتا تھا۔ اسی سحر بیانی کی وجہ سے آپ کے رفیق و ہمدم مولانا سعید احمد بزرگؒ انہیں جامعہ ڈابھیل کے

مبلغ کی خدمات پر بھی اصرار فرماتے تھے، مگر جسمانی نزاکت، مسلسل سفر سے عذر اور خاص کر کنتھاریہ کے متعلقین کو ناراض نہ کرنے کے جذبہ کے پیشِ نظر آپؒ نے یہ پیش کش بھی قبول نہیں فرمائی۔ ضلع بھروچ اور دیگر اضلاع کے متعدد مدارس میں امتحانِ سالانہ کے لیے بھی آپؒ کو بلایا جاتا تھا۔

گجراتی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے، برسہابرس ماہنامہ ''پیغام'' میں قرآن وحدیث کے اسباق تحریر فرمائے۔ میرے علم کے مطابق آپؒ نے ایک کتاب بھی تحریر فرمائی ہے، جس میں کسی خاص موضوع کے متعلق اسلامی نظریہ اور قرآن و حدیث کے دلائل اور اشعار درج کیے ہیں، خدا کرے وہ مسودہ سلامت ہو۔

خلاصہ یہ کہ آپؒ کی پوری زندگی علمِ دین کی تعلیم وتعلّم اور نشر واشاعت میں گذری ہے۔ اور ساتھ ہی قومی، ملّی اور تعلیمی تنظیموں میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

اے جانے والے! روح تیری شادکام ہو
حق مغفرت کرے، تیرا اونچا مقام ہو

ذاتی تعلقات

ایک ہی بستی کے باشندے ہونے کے سبب ابتدائی تعلیم کے زمانے سے ہم دونوں ایک دوسرے سے متعلق اور وابستہ رہے ہیں، نیز جس زمانے میں آپؒ

جمعیت علماء ضلع بھروچ کے جنرل سیکریٹری ہوا کرتے تھے، یہ ناکارہ اِن دنوں جمعیت علماء ضلع بھروچ کا صدر رہا کرتا تھا۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ہی تنظیم کے صدر اور سکریٹری کے تعلقات کس قدر گہرے اور پر اعتماد ہوں گے! تنظیموں کی میٹنگوں اور دینی اجلاسات میں راندیر، سورت، ڈابھیل، بڑودہ وغیر مقامات کا سفر ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔ حضرت مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری صاحبؒ بھی جب اصرار و حکم فرماتے تھے تو ہم ساتھ ہی ان کی خدمت میں پہنچتے تھے۔ ایسے انتہائی گہرے، اور پر اعتماد قریبی تعلقات کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ آپؒ انتہائی خلیق، نیک، متواضع، ہمدرد و مخلص، دوراندیش و مدبّر، مہمان نواز مخلص خادمِ دین تھے۔ آہ! اس وقت بھی ان کا مسکراتا اور ہر دل عزیز چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تصور بن کر ان کی یاد تازہ کرا رہا ہے۔

نہ بھولیں گے تجھے اے مردِ صالح!
تیری یاد آئے گی آتی رہے گی

حقیقت یہ ہے کہ آپؒ فقط ایک عالم نہ تھے، بلکہ ایک سچے مونس و ہمدم اور مشیر و رفیق تھے۔ آپ کی مسکراہٹ میں ایک عجیب کشش تھی جو دوست و دشمن ہر ایک کو جکڑ لیتی تھی۔ میری نظر میں اس کشش کا اصلی سبب آپؒ کا تواضع، علم و عمل اور اخلاص تھا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپؒ کے دل میں کسی سے کوئی نفرت نہیں تھی۔

تدفین

دارالعلوم بھروچ کنتھاریہ کی مسجد کے پاس وسیع میدان میں آپؒ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، راندیر، ڈابھیل، کٹھور، بڑودہ، دیوا، دیولا، بھڑکودرہ، جمبوسر، کاوی، اسلامپور، ساردو، وہالو، آچھود، کنتھاریہ، آمود، پریئج، بھروچ، شیر پورہ، منوبر، کرماڈ وغیرہ مختلف مقامات سے تقریباً ایک ہزار سے زائد مسلمانانِ گجرات نے نمازِ جنازہ میں شرکت فرمائی۔ نمازِ جنازہ جامعہ ڈابھیل کے مہتمم حضرت مولانا محمد سعید بزرگ صاحبؒ نے پڑھائی۔ دارالعلوم بھروچ، کنتھاریہ کے مہتمم حضرت مولانا آدم منوبری صاحب اور حضرت مولانا عبدالصمد وانکانیری صاحب، جامعہ ڈابھیل کے حضرت مفتی صاحب، دارالعلوم بھروچ، کنتھاریہ کے تمام اساتذہ اور مختلف مقامات سے تشریف لائے تمام ذمہ داران اور نوجوان علماء بڑی مقدار میں شریک ہوئے۔ آپؒ نے حضرت مولانا آدم صاحب سے کنتھاریہ کے قبرستان میں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی، چنانچہ احاطۂ دارالعلوم کے قریب ہی واقع قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں لائی گئی۔

اپنے وطن کاوی سے انتہائی محبت ہونے کے باوصف کنتھاریہ میں دفن ہونے کی خواہش کا سبب بہ ظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہالو اور کنتھاریہ میں آپؒ کے متعدد شاگردان اور محبین و متعلقین بستے ہیں، نیز دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ سے بھی زندگی بھر وابستہ رہے تو پھر موت کے بعد ان سے جدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب ان تمام متعلقین اور شاگردان کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ مرحوم مولانا کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کرتے رہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ جیسے عظیم بزرگ نے بھی اپنے متعلقین کو وصیت فرمائی ہے کہ: ''ہو سکے تو ہفتے میں ایک بار الحمد شریف اور تین بار قل ہو اللہ پڑھ کر ثواب پہنچاتے رہا کریں''۔

گجرات کے اور خصوصاً ضلع بھروچ کے علماء اور مخلصین؛ حضرت مولانا کی وفات پر غم وصدمہ محسوس کر رہے ہیں، کیوں کہ آئندہ تمام قومی وملی خدمت کے مواقع پر مرحوم مولانا کا خلا محسوس ہوگا۔

حق تعالی مولانائے مرحوم کی بال بال مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں مقام نصیب فرمائے اور غم وصدمہ میں ڈوبے ہوئے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔ (منشی عیسیٰ صاحب کا مضمون پورا ہوا۔)

مکتب کے اساتذہ

ابتدائی تعلیم جن اساتذہ سے حاصل کی اُن میں (۱) مولوی قاسم مزا کی کے والد (۲) مولانا آدم خانپوری (فاضلِ دار العلوم اشرفیہ راندیر) اور (۳) مولانا یعقوب بن امیجی ناٹھا کاوی کا ذکر ملتا ہے۔

جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں داخلہ

۱۳۶۹ھ میں چوں کہ مولاناؒ اپنے والد صاحبؒ کے ہمراہ ڈابھیل آ گئے

تھے؛ اس لیے اَب آگے کی تعلیم کا سلسلہ جامعہ ڈابھیل (جس کو لوگ ''دارالعلوم ثانی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں) سے شروع ہوا۔ چناں چہ آپ نے جامعہ ڈابھیل میں ''عربی سوم'' تک کی تعلیم حاصل کی، جس کی تفصیل مُندَرِجہٗ ذیل ہے:

فارسی اول: حضرت مولانا احمد شاہ صاحب پانڈور سملکیؒ سے۔

فارسی دوم: حضرت مولانا اسماعیل بھائلہ صاحب بسم اللہ ڈابھیلیؒ سے۔

عربی اول: دو اساتذہ سے پڑھا۔ شوال سے عید الاضحیٰ تک حضرت مولانا شوکت صاحب کوکنیؒ سے اور اُن کے بعد حضرت مولانا قمر الدین صاحب بروڈوی مدظلہ کے پاس مکمل کیا۔

عربی دوم: (۱) حضرت مولانا مصلح الدین صاحب بروڈوی دامت برکاتہم سے ''نور الایضاح'' اور ''قدوری'' (۲) حضرت مولانا خیر الرحمٰن پٹھان سرحدیؒ سے ''نفحۃ الیمن، مفید الدین، مرقات، ایساغوجی'' اور ''کلیاتِ خمسہ'' (۳) حضرت مولانا خلیل احمد لاجپوریؒ سے ''تیسیر المنطق'' اور (۴) حضرت مولانا قمر الدین صاحب سے ''ہدایۃ النحو'' اور ''کافیہ'' پڑھی۔

عربی سوم: (۱) حضرت مولانا مصلح الدین صاحبؒ سے ''اصول الشاشی'' (۲) حضرت مولانا ابراہیم صاحب پالن پوریؒ سے ''شرحِ جامی، نفحۃ العرب'' (۳) حضرت مولانا ابراہیم صاحب اندوری سے ''کنز الدقائق'' (۴) ''شرحِ تہذیب'': اولاً حضرت مفتی احمد بیمات صاحبؒ سے اور اُن کے حج پر چلے جانے

کے بعد مولانا مصلح الدین صاحب سے (۵) اور حضرت مولانا قمر الدین صاحب سے ''الدروس التاریخ الاسلامی'' پڑھی۔

مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ اور اعلیٰ تعلیم

شوال ۱۹۶۴ء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان کی مشہور ومعروف دینی درس گاہ: مظاہرِ علوم سہارن پور تشریف لے گئے اور وہاں متوسطات اور درجۂ علیا کی تمام کتابیں مختلف علوم وفنون کے ماہر اساتذہ سے پڑھیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

عربی چہارم: (۱) حضرت مولانا وقار صاحب بجنوریؒ سے ''شرحِ وقایہ'' (۲) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کشمیریؒ سے ''شرحِ جامی'' (۳) حضرت مولانا عاقل صاحب دامت برکاتہم [صاحب ''الدر المنضود شرح سنن ابی داؤد''] سے ''نور الانوار، المقامات الحریریۃ'' اور ''سبعہ معلقہ'' (۴) حضرت شیخ مولانا یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم سے ''قطبی'' (تصدیقات کا بیان) اور ''میر قطبی'' (۵) حضرت مولانا وقار علی صاحب بجنوریؒ سے فنِ مناظرہ میں ''رشیدیہ'' پڑھی۔

عربی پنجم: (۱) حضرت شیخ مولانا یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم سے ''ہدایہ اولین'' مع ''سراجی'' اور (۲) حضرت مولانا عاقل صاحب دامت برکاتہم سے ''جلالین'' مع ''الفوز الکبیر'' اور ''مختصر المعانی'' پڑھی۔

عربی ششم: (۱) حضرت مولانا منظور احمد صاحب سہارنپوریؒ سے ''ہدایہ

رابع‘‘ اور’’ درِّ مختار‘‘ کا کچھ حصہ اور (۲) حضرت مولانا شیخ یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم سے’’مشکاۃ‘‘ مع’’شرح نخبۃ الفکر‘‘ پڑھی۔

عربی ہفتم: (۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے’’بخاری شریف‘‘ مکمل (اور مسلسلات دومرتبہ۔ پہلی مرتبہ: ۱۹۶۶ء میں اور دوسری مرتبہ: ۱۹۶۷ء میں۔ اور تیسری مرتبہ ۱۹۷۶ء کو جامعہ ڈابھیل میں حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے پڑھی) (۲) حضرت مولانا شیخ یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم سے’’ابوداؤد‘‘ (دو گھنٹے) ’’ابنِ ماجہ، نسائی شریف‘‘ اور’’موطین‘‘ (۳) حضرت مولانا منظور احمد خان صاحب سہارنپوریؒ سے’’مسلم شریف‘‘ (۴) مولانا محمد اسعد اللہ رامپوریؒ سے’’طحاوی شریف‘‘ اور (۵) حضرت مولانا مظفر حسین صاحب اجراروی سے’’ترمذی وشمائل ترمذی‘‘ پڑھی۔

مندرجۂ بالا تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آپؒ نے کیسے کیسے آسمانِ علم وفضل سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ نے نہایت ہی محنت وجاں فشانی کے ساتھ اپنے زمانۂ طلبِ علمی کے مراحل طے کر کے ۱۳۸۷ھ مطابق: ۱۹۶۷ء کو’’ مظاہرِ علوم سہارنپور‘‘ سے سندِ فراغت حاصل کی۔

ملاحظہ: حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد صرف ایک سال مولانا زبیر اور مولانا شاہد کی خاطر بخاری شریف پڑھائی۔ پھر مدینۂ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں آپؒ کا وِصال ہوا، گویا مولانا: حضرت شیخ کے آخری شاگردوں

میں سے رہے۔

فراغت کے بعد آپؒ ڈابھیل تشریف لائے اور ۱۳۸۸ھ مطابق: ۱۹۶۸ء میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ہی میں ایک سال مفتی اسماعیل گورا راندیریؒ اور مفتی اسماعیل کچھولوی دامت برکاتہم کی زیرِ نگرانی افتا کی سَماعت کی؛ مگر مستقل کوئی کتاب درساً نہیں پڑھی۔

میدانِ تجوید میں

مولاناؒ نے دیگر درسیات کے ساتھ تجوید وقراءت کی بھی مختلف کتابیں پڑھی ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کے زمانۂ طالبِ علمی میں حضرت قاری عباس صاحب دھرم پوریؒ سے ''فیض العزیز'' اور ''مفتاح التجوید'' پڑھی، حضرت قاری صاحب قواعدِ تجوید کاپی میں لکھواتے تھے۔

(۲) حضرت قاری رمضان صاحب میواتیؒ سے ''فوائدِ مکیہ، جمال القرآن'' اور ''خلاصۃ البیان'' پڑھی۔

جب سہارن پور تشریف لے گئے تو وہاں حضرت قاری محمد سلمان صاحب سہارنپوری کے پاس تجوید کی ابتدائی کتابیں (فیض العزیز، مفتاح التجوید، فوائد مکیہ، جمال القرآن، خلاصۃ البیان) دُہرائیں۔ نیز پارۂ عم کی بعض مخصوص سورتوں کی مشق بھی کی۔ اور ''شاطبیہ'' و ''جزری'' حضرت قاری سلیمان صاحب دیوبندیؒ

سے پڑھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ کو تجوید وقرأت سے بھی خاصی دل چسپی تھی، سبعہ وعشرہ کی کتابیں پڑھنا اس کی بیّن دلیل ہے؛ مگر شاگردوں کو اِس کا علم مولاناؒ کی رحلت کے بعد ہوا۔

بیعت وسلوک اور تزکیۂ نفس

حضرت مولاناؒ دورانِ تعلیم عربی چہارم کے سال قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی -نور اللہ مرقدہ- کے ہاتھ پر بیعت ہو چکے تھے اور مسلسل پانچ یا چھ سالانہ تعطیلات حضرت شیخ کی خانقاہ میں گزاریں۔ حضرت شیخ ''دفتر والی'' مسجد میں نماز پڑھتے تھے، مولاناؒ بھی وہیں جاکر اپنے شیخ کے بالکل پیچھے مغرب اور عشا کی نماز ادا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ تزکیہ واحسان اور سلوک وطریقت کے منازل حضرت شیخ الحدیثؒ ہی کی نگرانی میں طے کرتے ہوئے آستانۂ پروردگار پر جبہہ سائی کے طور طریقے سیکھے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کے وصال کے بعد مولاناؒ نے فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے رجوع فرمایا اور کئی رمضان ''چھتہ والی مسجد'' میں حضرت مفتی صاحبؒ ہی کی خدمت میں گزارے۔ پھر حضرت مفتی صاحبؒ کے انتقال کے بعد امیرِ تبلیغی جماعت حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ سے رجوع کیا اور ایک مدت تک حضرت جیؒ کی صحبت میں مرکز نظام الدین آتے جاتے رہے۔

حضرت جیؒ کے رحلت فرما جانے کے بعد شیخ سلیمان موغلیہ نقشبندی (خلیفۂ اجل حضرت مولانا غلام حبیب نقشبندیؒ) سے ''ری یونین'' میں بہ ذریعۂ فون بیعت ہوئے اور تادمِ حیات اپنے شیخ کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مولاناؒ اُردو میں خط تحریر فرماتے تھے اور شیخ چوں کہ اُردو سے ناواقف ہیں؛ اس لیے مختلف طلبہ فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے پیش کرتے تھے اور اِس طرح جوابات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ازدواجی زندگی کا آغاز

فراغت کے بعد جب آپؒ گھر تشریف لائے تو سرزمینِ خانپور کے ایک عبادت گزار، نیکوکار اور فنِ تعمیر کے بہت ہی قابل شخص: جناب آدم ولی صاحب کی دُخترِ نیک اختر سے یکم ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق: یکم فروری ۱۹۶۸ء بروز جمعرات آپؒ کا عقدِ مسنون ہوا۔

اہلیہ محترمہ کا تعارف اور اُن کی خدمات

آپ کی اہلیہ محترمہ (وِلادت: ۱۰/ ۶/ ۱۹۹۵) -جنھیں لوگ ''دادی اماں'' کہتے ہیں- انتہائی نیک، عبادت گزار اور فرماں بردار خاتون ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ قرآنِ کریم کی حافظہ بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت میں کھپادی، ان کی خدمات کی ایک طویل فہرست ہے، جس کی ایک جھلک قارئین کی خدمت میں پیش ہے:

مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ: ''مولاناؒ کی ہمہ گیر خدمات جہاں بلاواسطہ ہے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) وہیں بالواسطہ بھی ہے۔ اُس خدمت کو بیان کرنے سے پہلے بہ طورِ تمہید مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک واقعہ سن لیں:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا پورا قافلہ ڈابھیل تشریف لایا، اُس زمانے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: ''یہ ڈابھیل وسملک والے ہمارے میزبان ہیں، یہ ہمارا اتنا اکرام کرتے ہیں تو آخر اِن کا بھی ہم پر کوئی حق بنتا ہے''۔ اور اس کے بعد شاہ صاحبؒ کبھی کبھی گاؤں اور اطراف کی مختلف مسجدوں میں تشریف لے جاتے اور خود اعلان کرتے کہ: ''بھائی! نماز کے بعد انور شاہ آپ سے کچھ کہے گا، تھوڑی دیر ٹھہر جایئے!'' پھر اس کے بعد شاہ صاحبؒ ایک دو حدیث پڑھتے اور اس کا ترجمہ کرکے چلے آتے۔ ایک مرتبہ ''کالا کاچھا'' والوں نے بلایا تو وہاں بھی اِسی طرح چند حدیثیں پڑھ کر ترجمہ کرکے واپس تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے اِن اکابر کے دل میں یہ احساس تھا کہ گاؤں والوں کا بھی کوئی حق ہے۔

اب ملاحظہ فرمایئے! حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کی جو اہلیہ تھیں، اُنھوں نے بھی اِس حق کو کس طرح ادا کیا؟ مسلسل کئی سال تک اُنھوں نے ڈابھیل وسملک والوں کی خدمت کی ہے، اور ڈابھیل وسملک میں ان کا فیض خوب پھیلا۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کے گھر میں خالہ جان (مولاناؒ

کی اہلیہ) تشریف لاتیں اور ’’فضائل اعمال‘‘ کی تعلیم کرتیں، گاؤں کی مستورات بھی اس میں شرکت کرتیں۔ اِس طرح ایک لمبے عرصے تک گاؤں میں اُن کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اِسی طرح گاؤں کی جامع مسجد کی طرف باقاعدہ آپ پڑھانے کے لیے تشریف لے جاتیں اور وہاں لڑکیوں کی دینی تعلیم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی ہے۔ نیز صبح کے وقت تو خود آپ کے گھر پر بھی مدرسہ چلتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالہ جان کے ہاتھوں بہت سی بچیاں حافظِ قرآن ہوئیں، اگر اُن کے نام شمار کرائے جائیں تو ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔

ابھی چند سال پہلے ہمارے ’’محمود نگر‘‘ میں تشریف لائیں اور کہا کہ: یہاں تعلیم ہوتی ہے کہ نہیں؟ تو بتایا گیا کہ: اجتماعی تعلیم تو نہیں ہوتی۔ تو اُنھوں نے کہا کہ: اِس سلسلے کو شروع کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے آکر باقاعدہ اِس سلسلے کو شروع کروایا اور ایک لمبے عرصے تک تعلیم ہوتی رہی۔

ان خدمات میں یقیناً مرحوم حضرت مولانا یوسف صاحب کاویؒ کا دخل رہا ہے، اُن کے مشوروں کو دخل رہا ہے، اُن کی بہت بڑی قربانیاں رہی ہیں۔ ابتدائی زمانے میں آپ کے بچے بھی چھوٹے چھوٹے تھے، اِن سب کو سنبھالنا، گھر کے سارے کام کاج کرنا، اِن سب جھمیلوں کے ساتھ دین کی اتنی بڑی خدمت انجام دینا؛ بس اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

’’ایں سعادت بزورِ بازو نیست‘‘

دادی امّاں کے حفظ کا واقعہ

بچپن ہی میں دادی امّاں کے سر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا تھا، ماں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اپنی سوتیلی ماں کے زیرِ تربیت زندگی بسر کرنے لگیں۔ اُسی زمانے میں آپ قرآن پاک حفظ کر رہی تھیں، سبق یاد کرنے کے لیے فجر کے وقت اٹھ جایا کرتی تھیں؛ مگر سوتیلی ماں کو اِن کے حافظ ہونے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی؛ اس لیے وہ ان کو آٹا گوندھنے میں لگا دیتی تھی کہ پڑھائی چھوڑ کر آٹا گوندھو! دادی اماں فرماتی ہیں کہ: ''اُس وقت میں آٹا گوندھتے گوندھتے روتی بھی جاتی تھی اور سبق بھی یاد کرتی جاتی تھی''۔

دادی امّاں کی اِسی قربانی کا ثمرہ تھا کہ اُنھوں نے کئی سال تک ڈابھیل وسملک والوں کی اتنی عظیم خدمات انجام دیں۔ فَتَقَبَّلَ اللّٰہُ مِنْهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ.

اولاد واحفاد

حضرت الاستاذؒ کی ایک صاحب زادی اور چھ صاحب زادے ہیں، ماشاءاللہ! سب کے سب (بہ شمول صاحب زادی) حافظِ قرآن اور عالمِ دین ہیں اور –بحمدللہ– تمام ہی اپنے اپنے مقام پر دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جن کے مختصر سوانحی خاکے قارئین کی خدمت میں پیش ہے:

(۱) حضرت مفتی خلیل احمد صاحب:

وِلادت: ۶رمئی ۱۹۷۱ء بہ مقام ''تراج''۔

چھ سال کی عمر میں آپ نے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل ہی میں رہ کر حفظِ قرآنِ کریم کا سلسلہ شروع کیا، جس میں آپ نے مختلف اساتذہ کے پاس پڑھا، جن میں حضرت مہتمم صاحب (مولانا احمد بزرگ دامت برکاتہم) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

تکمیلِ حفظ کے بعد آپ نے آگے کی تعلیم کا سلسلہ یہیں جامعہ ہی میں شروع کیا اور فارسی اول سے لے کر دورۂ حدیث شریف تک کی مکمل تعلیم جامعہ ہی میں حاصل کر کے ۱۹۹۱ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ نیز شعبۂ تجوید وقراءت سے بھی منسلک ہو کر حضرت قاری ومقری احمد اللہ صاحب بھاگلپوری دامت برکاتہم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہوئے قراءاتِ حفص وسبعہ عشرہ وغیرہ کی بھی تکمیل کی۔

فراغت کے بعد آپ نے ایک سال جامعہ ہی میں افتا بھی کیا۔اس کے بعد حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اور دو سال حضرت فقیہ الامت کی خدمت میں گزارے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح اِن کے والد مولانا یوسف صاحبؒ کی جماعت حضرت شیخ کے پاس آخری جماعت تھی، اِسی طرح جامعہ ڈابھیل سے اِن کی جماعت بھی حضرت فقیہ الامتؒ کے پاس امتحان دینے والی آخری جماعت تھی اور حضرت مفتی صاحبؒ نے آخری دستخط اِن ہی کی جماعت کے رفقائے درس کی سندوں پر کی۔

اس کے بعد ۱۹۹۵ء سے آپ کی تدریسی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے بزرگوں کے مشورے سے ''مدنی دار التربیت کرمالی انکلیشور'' میں پانچ مہینے تدریسی خدمات انجام دیں؛ مگر جب وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی تو پھر آپ اپنے تدریسی سلسلے کو موقوف کر کے پانچ مہینے کے لیے جماعت میں چلے گئے۔

اس کے بعد حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری ادام اللہ فیوضہم علینا کے مشورے سے مدرسہ حقانیہ کٹھور تشریف لے گئے اور ۲۰۰۹ء تک وہیں اپنی تدریسی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ مدرسہ کٹھور میں آپ صدر مدرس بھی تھے اور مدرسے کی پوری سرپرستی آپ خود ہی کرتے تھے۔ نیز کٹھور کی ظاہری اور باطنی ترقی میں آپ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس کے بعد حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری – أدام اللہ فیوضھم علینا – کے حکم سے آپ اپنے آبائی وطن ''کاوی'' تشریف لے گئے اور ''جامعہ نقیب الاسلام کاوی'' میں صدر مفتی وشیخ الحدیث کی حیثیت سے تاہنوز خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے زیرِ درس کتب میں بخاری ومسلم سرِفہرست ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی تمام خدمات کو قبول فرما کر آپ کی عمر میں خوب برکت عطا فرمائے۔

(۲) مولانا رشید احمد صاحب:

وِلادت: ۸/ مئی ۱۹۷۳ء۔

ابتدائی تعلیم: تختی وغیرہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں استاذِ محترم حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم العالیہ کے پاس پڑھا۔ اس کے بعد ناظرۂ قرآنِ کریم کا سلسلہ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب بھٹئی کے پاس شروع کیا اور بیس پارے ناظرہ مکمل ہونے کے بعد حضرت مفتی شبیر صاحب کے پاس حفظ شروع کیا اور مولانا شفیع میاں صاحب سملکیؒ کے پاس حفظ کی تکمیل کی۔

تکمیلِ حفظ کے بعد عربی پنجم تک جامعہ ہی میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ ومعیاری تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور ۱۹۹۷ء میں فراغت حاصل کی۔ نیز دارالعلوم ہی میں ایک سال ''تخصص فی الادب'' بھی کیا۔

۱۹۹۹ء سے آپ نے اپنی تدریسی خدمات کا سلسلہ شروع کیا۔ اولاً جامعہ اصلاح البنات میں پانچ سال خدمات انجام دیں، جن میں آپ کے زیرِ درس کچھ ابتدائی کتابوں کے ساتھ مشکوٰۃ شریف، جلالین اور ترمذی شریف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے بعد ۲۰۰۳ء میں آپ ساؤتھ افریقہ تشریف لے گئے اور وہاں ''جامعۃ الشیخ زکریا'' میں تاہنوز چند فنون کی کتابوں کے ساتھ ساتھ ترمذی شریف اور ہدایہ ثانی وغیرہ کی تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۳) قاری سعید احمد صاحب:

ولادت: ۲۹/ جولائی ۱۹۷۵ء

ناظرہ وحفظ جامعہ کے استاذ مولانا فرید صاحب نانا ابن قاری محمد رشید بزرگ کے پاس مکمل کیا۔

درسِ نظامی کی تکمیل جامعہ سے ۱۹۹۷ء میں کی۔ساتھ میں حضرت قاری احمد اللہ صاحب بھاگلپوری دامت برکاتہم سے سبعہ قراءت کی تعلیم حاصل کی۔

خدمت: دوسال جامعہ حقانیہ کٹھور میں حفظ پڑھایا،ساتھ میں عربی اول کی دو گھنٹیاں بھی منسلک رہیں۔

پھر ایک سال مدرسہ اصلاح البنات سملک میں درجۂ عربی چہارم تک شعبۂ تجوید میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔

اس کے بعد دس سال تک مدرسہ دعوۃ الایمان مانکپور ٹکولی سے منسلک رہے، جہاں ابتدائی درجات میں فنون کی کتابیں پڑھائیں اور ساتھ ہی شعبۂ تجوید میں بھی افادہ جاری رکھا۔آپ ہی کی توجہات سے اس مدرسہ میں قراءات سبعہ کا افتتاح عمل میں آیا۔

فی الحال نصیر پور بھٹئی میں مکتب،حفظ اور امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

(۴) قاری عبدالرحمٰن صاحب:

ولادت: ۱۲؍ستمبر ۱۹۷۷ء۔

تعلیم کا سلسلہ یہیں جامعہ ڈابھیل ہی سے شروع کیا۔چنانچہ ناظرہ حضرت

قاری محمد سارد وی صاحبؒ کے پاس کیا۔ حفظ کی ابتدا حضرت مفتی یوسف ہانس صاحب دامت برکاتہم کے پاس کی اور تکمیل مفتی شفیع میاں صاحبؒ کے پاس کی۔

عالمیت کی تعلیم از اول تا آخر آپ نے یہیں جامعہ ہی میں حاصل کر کے ۲۰۰۲ء میں سندِ فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد ۲۰۰۳ء میں حضرت قاری احمد اللہ صاحب مدظلہ کے پاس تخصص فی التجوید والقراءات بھی کیا۔

۲۰۰۳ء کے اواخر میں آپ ''ٹرینیڈاڈ'' (ویسٹ انڈیز) تشریف لے گئے اور وہاں آپ شعبۂ تجوید کے مدرسِ اول رہے؛ چوں کہ آپ ہی کے ذریعہ سے وہاں شعبۂ تجوید کا قیام عمل میں آیا؛ اس لیے اس دیار میں جا بہ جا تجوید کی شمع روشن کرنے والے سب آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ اور الحمد للہ تاہنوز آپ اِسی خدمت کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

(۵) شاکرہ:

انھوں نے اپنی والدہ (مولانا یوسف صاحب کی اہلیہ) کے پاس حفظِ قرآنِ کریم کی تکمیل کی۔ نیز اردو اور نحو وصرف سے بھی کچھ تھوڑی بہت مناسبت ہے۔ اِس وقت ''ٹرینیڈاڈ'' میں مقیم ہیں۔ ''ٹرینیڈاڈ'' میں ان کے جانے سے ہی مستورات وطالبات میں حفظ کا شعبہ قائم ہوا، بے شمار طالبات اِن کے پاس حافظ ہوئیں۔

ان کے متعلق استاذِ محترمؒ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ: ''الحمد للہ! ہماری لڑکی ویسٹ انڈیز میں بچیوں کو قرآنِ کریم پڑھاتی ہیں اور جہاں ناظرہ پڑھانا بھی

مشکل ہے وہاں اب تک بیس سے زائد بچیوں کا حفظ مکمل کروا چکی ہے‘‘۔

(۶) مولانا مسعود احمد صاحب:

وِلادت: ۲۶؍فروری ۱۹۸۲ء۔

ابتدائی تعلیم، حفظ اور اردو دینیات جامعہ میں مکمل کیا۔ اس کے بعد عالمیت کے لیے حضرت استاذ مرحوم کی خواہش پر ازہرِ ہند دار العلوم دیو بند تشریف لے گئے اور عربی اول سے لے کر دورۂ حدیث شریف تک کی مکمل تعلیم دار العلوم دیو بند ہی میں حاصل کر کے ۲۰۰۴ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد ’’ٹرینیڈاڈ‘‘ (ویسٹ انڈیز) تشریف لے گئے اور ’’دار العلوم ٹرینیڈاڈ‘‘ میں استاذِ حدیث کی حیثیت سے تا ہنوز خدمات انجام دے رہے ہیں۔

(۷) قاری زکریا صاحب:

ابتدائی تعلیم، حفظ، عالمیت اور تخصص فی التجوید جامعہ ہی میں کیا۔ اس کے بعد چند سال تک ’’ٹکولی‘‘ میں، اس کے بعد سملک کی مسجد میں امامت اور مکتب کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اِس وقت ’’ٹرینیڈاڈ‘‘ میں حفظ پڑھانے میں مصروفِ عمل ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ آپ کے تمام صاحب زادگان اور صاحب زادی دین کی بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور جتنے پوتے یا نواسے ہیں اُن میں سے بھی اکثر حافظِ قرآن ہو چکے ہیں اور جو حافظ نہیں، وہ ابھی

حفظ کررہے ہیں۔ غرض یہ کہ ”ایں خانہ ہمہ آفتاب است“۔

یہ کہنے کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ ان سب کو علمِ دین کے زیور سے آراستہ کرنے اور دین کی خدمت میں لگانے کا سہرا حضرت مولانا کے سر ہی بندھتا ہے۔

میری زندگی کا مقصد: تیرے دیں کی سرفرازی
میں اِسی لیے مسلماں، میں اِسی لیے نمازی

مولاناؒ کی خدمات

چلتی ہی رہے گی تیری خدمات کی کشتی
بہتا ہی رہے گا تیرے الطاف کا دھارا
اب بھی تیری الفت پہ کٹا دیتے ہیں سر کو
اب بھی تیرا نام ہمیں جان سے ہے پیارا

۱۳۸۸ھ کے بعد مولاناؒ اپنی زندگی کی کشتی کا رُخ موڑتے ہوئے اُسے علمی خدمات کی سَمت میں ڈال دیتے ہیں اور پھر یہاں سے زندگی کا ایک ایسا سفر شروع ہوتا ہے جس کی راہ میں سینکڑوں رُکاوٹیں مُتلاطِم موجوں کی طرح پیش آتی رہیں اور سفینۂ حیات کو بحرِ بے کراں کی اتھاہ گہرائیوں میں غرقاب کرنے کی انتھک کوششیں کرتی رہیں؛ مگر مولاناؒ طوفانی تھپیڑوں سے مقابلہ آرا ہوکر سمندر کی کٹھنائیوں کو چیرتے ہوئے اپنی کشتی کو بندرگاہ پر لنگر انداز کرکے ہی دَم لیتے ہیں

اور اِس طرح لنگر ڈال جاتے ہیں کہ دوبارہ اُس لنگر کے اُٹھنے کا تصور وخیال ناممکن ہی نہیں ؛ بلکہ مُحال نظر آتا ہے۔

مولاناؒ نے اپنی پوری زندگی دینِ متین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی، مولاناؒ کی خدمات کا دائرہ مکمل پانچ دہائیوں (یعنی نصف صدی) پر محیط ہے۔ اِس پچاس سالہ دور میں گوناگوں خدمات کے ایسے نقوش ثبت کیے ہیں جو ہم جیسے علم کے رہرَوں کے لیے یقیناً کسی مشعلِ راہ سے کم نہیں۔

تو آیئے! ذرا مولاناؒ کی نصف صدی پر محیط خدمات پر نظر ڈالتے ہیں:

تدریسی خدمات

۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں مولاناؒ پوری طرح علوم وفنون سے لیس ہو کر تدریسی خدمات کے میدان میں اترتے ہیں۔ خدمت کا پہلا قدم یہ رہا کہ جب ''تاراپور'' میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی اور باقاعدہ وہاں درجۂ علیا کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو آپؒ اور آپ کے بڑے بھائی: مولانا یعقوب صاحبؒ وہاں کے ''اولین مدرسین'' رہے ہیں۔ آپؒ نے پہلا سال ''دارالعلوم تاراپور'' میں گزارا اور وہاں عربی پنجم وششم تک کی کتابیں پڑھائیں۔

اس کے بعد آپؒ ''مفتاح العلوم تراج'' تشریف لے گئے وہاں ''صدر مدرس'' کی حیثیت سے آپؒ کا تقرر عمل میں آیا، ساتھ ہی ساتھ آپ نے عربی دوم وسوم کی کتابیں بھی پڑھائیں اور مسلسل دو سال (۱۳۹۰ھ و ۱۳۹۱) تک طلبہ کی

علمی تشنگی بجھاتے رہے۔ اِن دو سالوں میں مندرجۂ ذیل کتابیں آپؒ کے زیرِ تدریس رہیں:

پہلا سال ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰	
۱	ترجمۂ قرآن (آخری ۴/ پارے)
۲	مفتاح القرآن (حصہ: ۴-۵)
۳	بحر الآداب (حصہ: ۱-۲)
۴	النحو الواضح (حصہ: ۲-۳)
۵	منہاج العربیۃ (حصہ: ۲-۳-۴-۵)

دوسرا سال ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱	
۱	نور الایضاح
۲	قدوری
۳	تیسیر المنطق
۴	النحو الواضح (حصہ: ۱-۲)
۵	بحر الآداب

جامعہ ڈابھیل میں تشریف آوری

جامعہ سے آپؒ کو والہانہ تعلق اور بے انتہا محبت تھی، اِسی محبت نے آپ کو

چند سالوں کی جدائی کے بعد جامعہ میں لا پہنچایا۔ چنانچہ آپؒ اپنی علمی خدمات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مہتمِمِ جامعہ حضرت مولانا محمد سعید صاحب کے حکم پر ۱۹۷۲ء کو اپنی مادرِ علمی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں قدم رنجہ ہوئے۔ جامعہ میں آپؒ نے پینتالیس سال تک نہایت ہی خلوص وللّٰہیت کے ساتھ بے لوث وہمہ گیر خدمات انجام دیں اور شباب سے شیب تک کا زمانہ ڈابھیل ہی کی تدریس میں صرف کر دیا، اتنا ہی نہیں؛ بلکہ لحد بھی ڈابھیل ہی کی سرزمین میں تجویز کی۔

ڈابھیل میں تقرر کا سبب

آپؒ جب ''مفتاح العلوم تراج'' میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، اُس دوران جامعہ ڈابھیل سے آپؒ کو امتحان لینے کے لیے مدعو کیا گیا، آپؒ نے اپنی جید علمی استعداد کی روشنی میں طلبہ کا اس انداز سے امتحان لیا کہ اَربابِ اہتمام کے کان کھڑے ہو گئے اور آپؒ کے انداز سے متأثر ہو کر- یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہیں کے پلے بڑھے ہوئے ہیں -تقرر نامہ خدمت میں پیش کیا تو آپؒ نے اُس درخواست کو خدا کی دین اور اپنے بڑوں کا حکم سمجھتے ہوئے بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول فرمالیا۔

دارالافتا کے فتاوی کی تنقیح

حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہ- رحمۃ اللہ علیہ- کے فتوے دارالافتا کے رجسٹروں میں پرانے انداز میں لکھے ہوئے تھے اور طویل زمانہ گذر جانے کی وجہ

سے انتہائی بوسیدہ ہوچکے تھے، حروف بھی مٹتے جارہے تھے اور پڑھنے میں بھی بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اربابِ افتا نے مناسب سمجھا کہ ان فتاوی کو صاف کیا جائے؛ تاکہ یہ گراں قدر سرمایہ اُمت کے سامنے آجائے؛ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا، اس لیے کہ تحریریں پرانے اسلوبِ نگارش پر ڈھلی ہوئی تھیں، اُس کا پڑھنا اور سمجھنا ہر ایک کے بَس کی بات نہیں تھی۔

چنانچہ اِس نازک اور جنجال گھاٹی کو پار کرنے کے لیے یہ بارِ گراں آپؒ کے دوشِ ناتواں پر ڈالا گیا، آپؒ نے بہ خوشی اِس کام کو قَبول کرتے ہوئے انتہائی جاں فشانی کے ساتھ فتاوی کو نقل کرنا شروع کردیا اور مسلسل دو سال تک اِس خدمت کو انجام دے کر اپنے بعد آنے والوں کے لیے اِس میدان میں ایک طریقۂ کار، نمونۂ عمل اور نشانِ قدم چھوڑ گئے۔

تنقیحِ فتاویٰ میں آپ کا طریقۂ کار

ایک مرتبہ حضرت الاستاذ مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم نے دورانِ درس مولانا یوسف صاحبؒ کے تذکرے پر فرمایا کہ: جب میں فراغت کے بعد اکابر کے ایما پر اپنے دادا (حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ) کے فتاوی کی تنقیح کرنے کے لیے بیٹھا تو کچھ رہنمائی حاصل کرنے کے لیے مولانا یوسف صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ: مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس بارِ گراں کو کس طرح برداشت کروں، آپ نے بالکل شروع میں سب سے

پہلے ایک عرصے تک اِس پر کام کیا ہے، اِس سلسلے میں آپ کا طریقۂ کار کیا تھا؟ براہِ مہربانی آپ میری رہنمائی فرمائیں۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ: جب میں نے رجسٹروں کو دیکھا تو اُس کی تحریریں صاف نہیں تھیں، سمجھنے میں بہت پریشانی ہوتی تھی، میں نے اُن تحریروں کو پڑھنے کے لیے بلّوری کانچ منگوایا اور اُس سے جتنا سمجھ میں آتا اتنا لکھ لیتا، اور جو سمجھ میں نہیں آتا اس کی جگہ خالی چھوڑ دیتا، پھر بعد میں خوب غور وفکر کر کے جو لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا وہاں اُس کو ڈال دیتا، آپ بھی اِسی طرح کرو، جتنا سمجھ میں آئے لکھ لو، باقی کے لیے جگہ چھوڑ دو، بعد میں سوچ سمجھ کر اس جگہ کو پُر کر دینا۔ اس قسم کی کچھ مفید ہدایات ارشاد فرمائیں۔

حضرت مفتی عباس صاحب -دامت برکاتہم- فرماتے ہیں کہ: میں نے مولاناؒ کی بتائی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرنا شروع کیا تو ابتدا میں ناتجربہ کاری کی بنا پر کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا؛ مگر بعد میں -بفضلہٖ تعالیٰ- بہت ہی سُرعت کے ساتھ اِس میدان میں آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ کام مکمل ہو کر تقریباً تمام فتوے ''فتاوی سنگرہ'' کے نام سے گجراتی زبان میں منظرِ عام پر آ گئے اور اب اردو زبان میں ان پر کام ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں اَب تک تین جلدیں ''فتاوی بسم اللہ'' کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ اِس وقت بھی -الحمد للہ- بہت تیزی کے ساتھ کام آگے بڑھ رہا ہے۔

غرض یہ کہ اس پورے مبارک اور اہم کام کی ابتدا مولانا کے ہاتھوں ہوئی اور یقیناً اسلاف کی اس امانت کو امت تک پہنچانے میں مولانا کا بڑا کردار رہا۔

نیابتاً تدریسی خدمات

اِن دوسالوں میں آپؒ نے صرف فتاوی کی تنقیح ہی کا کام نہیں کیا؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کسی استاذ کے سفر یا بیماری کی رخصت کے زمانے میں نیابتاً تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ اِس ضمن میں آپؒ کو بہت سی کتابوں کے مختلف اسباق پڑھانے کا موقع ملا۔ مثلاً حضرت مولانا ابراہیم صاحب پٹنی -دامت برکاتہم- کی علالت (ٹی بی) کے زمانے میں اور حضرت مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی -دامت برکاتہم- کے بیرونِ ملک سفر کے زمانے میں اُن سے متعلق اسباق آپؒ نے پڑھائے۔

مستقل مسندِ تدریس پر

دوسالہ نیابتی تدریسی دور میں آپؒ کی صلاحیتیں جب خوب نکھر کر اربابِ اہتمام کے سامنے آشکارا ہوگئیں، تو پھر آپؒ کو مستقلاً عربی اوّل کی مکمل تعلیم کے لیے مسندِ تدریس پر جلوہ افروز کردیا گیا۔

۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۴ء میں بدقسمتی سے جامعہ کے حالات خراب ہوگئے اور اسٹرائک کا اَلم ناک واقعہ پیش آیا، جس کے نتیجے میں اکابرِ اربعہ: (۱) حضرت مولانا ابرار صاحب دھلیویؒ [جو اُس وقت مسلم شریف پڑھاتے تھے]

(۲) حضرت مفتی احمد صاحب دیولا (۳) حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری (۴) حضرت مولانا ابراہیم صاحب پٹنی - دامت برکاتہم العالیہ- مستعفی ہو گئے ،اس موقع سے آپؒ کو عربی دوم کا درجہ دیا گیا جسے آپؒ نے کئی سال تک نہایت کامیابی سے پڑھایا۔

پھر جس زمانے میں حضرت مولانا ابوبکر صاحب غازی پوریؒ مستعفی ہوکر جامعہ سے تشریف لے گئے تو آپؒ کی خداداد صلاحیتوں کے پیشِ نظر عربی سوم، چہارم اور پنجم تک کی کتابیں آپؒ کے سپُرد کی گئیں، پھر رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے دورۂ حدیث شریف تک پہنچ گئے اور زندگی کے آخری لمحات تک حدیث شریف کی خدمات انجام دیتے رہے۔

اِدھر پچھلے کچھ سالوں سے ضعف ونقاہت کی وجہ سے اربابِ اہتمام نے صرف ''مشکاۃ المصابیح'' مع ''الفوز الکبیر'' اور ''مسلم شریف'' آپؒ کے سپرد کیں اور بحمد اللہ تا دمِ حیات احادیث کی یہی کتابیں آپؒ کے زیرِ تدریس رہیں۔

خانقاہ کی باگ ڈور

جس زمانے میں حضرت مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم جامعہ ڈابھیل میں تدریسی خدمات کے ساتھ فتویٰ نویسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، اُس دور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے حکم پر اُنھوں نے رمضان المبارک میں خانقاہ کا سلسلہ شروع فرمایا۔ جب اُنھوں نے یہ

نظام شروع کیا تو خانقاہ کے اصل دولہے تو وہی تھے؛ لیکن اُس کی باگ ڈور حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کے ہاتھ میں رہی۔ روزِ اول سے ایک لمبے زمانے تک آپؒ نے اِس خانقاہی نظام کو چلایا۔ چنانچہ ظہر کے بعد آپؒ ختمِ خواجگان کرواتے اور پھر اس کے بعد بڑے عجز و نیاز کے ساتھ لمبی دعا فرماتے تھے۔ ایک لمبے عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کی مستقل خانقاہ شروع ہوئی تو اس میں بھی آپؒ نے شرکت فرمائی؛ مگر چوں کہ آپؒ کا سلسلہ دعوت وتبلیغ کے ساتھ بھی جُڑا ہوا تھا؛ اس لیے آپؒ بہت سی مرتبہ جماعت میں یا مرکز نظام الدین حضرت جی ثالث مولانا انعام الحسن صاحبؒ کی خدمت میں تشریف لے جاتے۔ اس کے علاوہ حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کی جب منگل والی مجلس کا آغاز ہوا تو اس میں بھی آپؒ بڑی پابندی کے ساتھ بلا ناغہ شرکت فرماتے رہے۔

تبلیغی خدمات اور سرگرمیاں

علمی وتدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ جامعہ میں رہتے ہوئے دعوت وتبلیغ کے ساتھ بھی آپؒ خاصی دل چسپی رکھتے تھے۔ آپؒ ہی کی وہ ذاتِ بابرکات ہے جس سے جامعہ میں یہ شعبہ خوب پھلا، پھولا اور فروغ پایا، طلبہ کے دل میں اِس کام کی اہمیت و وقعت اور عظمت کے پہرے بٹھائے۔

آپؒ نے ایک ایسے دور میں یہ مبارک سلسلہ شروع کیا تھا، جب کہ طلبہ

میں اِس شعبے کے تعلق سے اتنی بیداری اور چہل پہل نہیں تھی جتنی آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ فضا تھی جہاں ہر طرف سے مخالفتوں کی ہوائیں چل رہی تھیں، اِس میں جُڑنے والے جو گنے چُنے اَحباب تھے اُن کو کام کرنے نہیں دیا جاتا تھا، ہر طرف سے نکتہ چینی کی بوچھاریں اُن پر برستی تھیں، طعن وتشنیع کے ذریعے اُن کے اُٹھتے حوصلوں کو مسمار کردیا جاتا تھا؛ مگر آپؒ بڑی جواں مردی کے ساتھ اِس میدان میں ڈٹے رہے اور اس میں لگنے والے طلبہ کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے، ہمہ وقت قیمتی نصیحتوں اور حوصلہ افزا کلمات سے اُن کے دلوں کو بڑھاتے اور اُن کے زخم خوردہ قلوب پر بلند ہمتی، ثابت قدمی اور پامردی کے مرہم رکھتے۔

دعوت وتبلیغ کے کام سے آپؒ کو زمانۂ طالبِ علمی ہی سے لگاؤ تھا اور اِس درجہ لگاؤ تھا کہ زمانۂ طالبِ علمی میں سالانہ تعطیلات کے موقع پر اولاً چلّے میں چلے جاتے اور چلّہ پورا کر کے حضرت شیخؒ کی خانقاہ میں تشریف لے جاتے۔ جامعہ میں جب آپؒ نے اِس کام کو شروع کیا تو ہر ہفتے طلبہ کی جماعت مختلف علاقوں میں خود لے جاتے اور اخلاص وللّٰہیت اور تواضع وانکساری کا پیکر بن کر تمام انتظامات کی از خود فکر فرماتے۔ کئی مرتبہ آپؒ ''ویسما'' جماعت لے جاتے اور واپسی پر خرچ نہ ہونے کی بنا پر سامان کندھے پر لاد کر ''ویسما'' سے ڈابھیل پیدل چل کر تشریف لاتے۔

جب تک صحت نے ساتھ دیا، تعطیلات کے موقع سے آپؒ خود طلبہ کو لے کر نکل کھڑے ہوتے۔ مدتِ دراز تک یہی سلسلہ رہا؛ مگر کہتے ہیں نا کہ: ''زندگی

ایک سائے کی طرح ہے'' صحت نے زوال کا رُخ کیا، ضعف ونقاہت اور مختلف قسم کے اَمراض کا حملہ ہونے لگا، اس کے باوجود بھی آپؒ اِس میں پوری طرح منہمک رہے اور اپنی جِدّ وجُہد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جمعرات کے چوبیس گھنٹے کی جماعت ہو، یا سالانہ کے موقع پر چِلّے کی جماعت ہو، جب تک یہ ساری جماعتیں روانہ نہ ہو جاتیں، آپؒ مسجد ہی میں تشریف رکھتے اور اپنی زندگی کے بیش قیمت تجربات کی روشنی میں طلبہ کو مستفیض فرماتے۔ خصوصاً چلّے میں نکلنے والے ساتھیوں سے فرماتے کہ: ''سب سے پہلے اپنے گھر دو چار روز والدین کے پاس رہ کر اللہ کی راہ میں نکلنا اور ۲۷ر رمضان کو چاہے تمھارا چلّہ پورا ہو یا نہ ہو اپنے گھر والدین کی خدمت میں روانہ ہو جانا''۔

جیسا کہ ہمارے یہاں دستور ہے کہ سال کے اَخیر میں سالانہ جماعت کی تشکیل کے لیے علما واکابرین کی تشریف آوری ہوتی ہے، ایسے موقع پر آپؒ تمام مجالس میں بڑے اہتمام کے ساتھ شرکت فرماتے۔

ایک مرتبہ آپؒ کو اطلاع ملی کہ ڈابھیل کی جامع مسجد میں ''ندوۃ العلماء'' سے طلبہ کی جماعت آئی ہوئی ہے، آپؒ نے چند ذمے دار طلبہ کو بُلا کر کہا کہ: جامع مسجد میں ندوہ کے طلبہ کی جماعت آئی ہوئی ہے، آپ لوگوں کو اُن کی خدمت کے لیے آج کی شب وہیں رُکنا ہے۔ بعد ازاں جب یہ جماعت جامعہ کی مسجد میں آئی تو آپؒ اُن کی ملاقات کے لیے بہ نفسِ نفیس تشریف لے گئے؛ حالاں کہ آپؒ

چاہتے تو جامعہ کے استاذ ہونے کی حیثیت سے آپؒ اُن کو ملاقات کے لیے درس گاہ میں بلا سکتے تھے۔ اُس کے بعد مہتمم صاحب مدظلہ العالی سے درخواست کی کہ: جو گھنٹے خالی ہوں اُن میں اِن آئے ہوئے مہمانوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اِن طلبہ کی تشکیل کریں۔ چنانچہ مولاناؒ کی درخواست پر آئی ہوئی جماعت (جن میں صرف اور صرف طلبہ تھے) کا دورۂ حدیث شریف میں تشکیلی بیان ہوا۔

میں یہاں پر ایک اور بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے جامعہ میں بدھ کے دن طلبہ میں جو تربیتی و تشکیلی خطاب ہوتا ہے، اِس مبارک سلسلہ کا سہرا ابھی آپؒ ہی کے سَر ہے۔ اخیری چند سالوں کے علاوہ آپ زندگی بھر بنفس نفیس اس میں شریک ہوتے رہے۔

غرض یہ کہ آپؒ نے پوری زندگی اِس دعوت وتبلیغ کی مبارک کڑی سے اپنے آپ کو جوڑے رکھا، تن مَن دَھن کی بازی لگا کر اِس کو ایسا سیراب کیا کہ آج ہماری نگاہوں کے سامنے یہ شجر پھولتا اور پھلتا نظر آ رہا ہے۔

ناظمِ تعلیمات

جامعہ کی تعمیر وترقی میں -بالخصوص اصلاحی وروحانی اور تربیتی تعلق سے- سب سے بڑا ہاتھ اگر کسی کا ہے تو وہ نمونۂ سلف حضرت الاستاذ مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم العالیہ کا ہے۔ ایک عرصے تک (۱۳۹۵ھ سے دس سال تک) حضرتِ والا نے نظامتِ تعلیم کے فرائض انجام دیے، پھر جب حضرت مفتی

صاحب کا ۱۴۰۶ھ میں مستقلاً دارالافتاء میں تقرر ہوا، تو نظامتِ تعلیم کا بار آپ کے کندھوں سے اٹھا لیا گیا۔ ''حضرت'' کی نظامت کے بعد استاذِ مکرّم حضرت مولانا یوسف صاحبؒ ناظمِ تعلیمات کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپؒ نے اِس ذمے داری کو بھی بہ سروچشم قبول فرما کر ایک عرصے تک دل وجان سے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔

آپؒ کا معمول تھا کہ نمازِ فجر سے گھنٹہ پون گھنٹہ پہلے ہی دارالاقامہ میں تشریف لے آتے اور انتہائی حلم و بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے طلبہ کو مسجد کی طرف روانہ کرنے کے لیے بہ نفسِ نفیس بیدار کرتے۔ اِس دوران اگر کسی طالبِ علم سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو خشم گیں ہونے کے بجائے نرم دلی سے اُس کو اِس طرح تنبیہ کرتے کہ اُس کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔

چنانچہ اِس سلسلے میں حضرت مفتی فرید کاوی مدظلہ العالی رقم طراز ہیں:

''دورِ نظامت میں جب کہ طلبہ کی تعلیم وتربیت براہِ راست آپ سے متعلق تھی، صبح وشام طلبہ کو بیدار کرنے کے لیے دارالاقامہ میں بھی تشریف لاتے تھے، یوں تو مدرسہ نے دارالاقامہ کے مختلف حصوں میں بڑے طلبہ کو ذمہ داری سپرد کر رکھی تھی، پھر بھی حضرت مولاناؒ اس کا خوب اہتمام فرماتے تھے۔ جمعہ کے روز چوں کہ بڑے طلبہ مدرسہ سے باہر ہوتے یا کھیل اور تفریح کے بعد گہری نیند سو جاتے، اس لیے ایسے مواقع پر بذاتِ خود تشریف لانے کا خاص اہتمام فرماتے

تھے اور جمعہ اور عصر کی اذان سے بہت پہلے، تقریباً ۴۵-۵۰ منٹ قبل دارالاقامہ پر آجاتے۔ چھوٹے بچوں اور جوانوں کو نیند سے بیدار کرنا صبر آزما کام ہے، مگر حضرت مولانا کبھی غصہ نہیں فرماتے تھے، اپنی عام رفتار اور عادت کے مطابق دارالاقامہ میں گھومتے اور کمروں میں جاجا کر نرمی وشفقت سے طلبہ کو بیدار فرماتے تھے۔ دارالاقامہ کی دونوں عمارتوں اور تینوں منزلوں پر خود چکر لگاتے تھے''۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم نے ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ: مولاناؒ کے ناظمِ تعلیمات کے زمانے کا واقعہ ہے کہ جب گاؤں میں ''ٹی وی'' (T.V) آئی، تو طلبہ کرکٹ کے ٹورنامنٹ وغیرہ دیکھنے کے لیے جن کے گھر ٹی وی (T.V) ہوتی وہاں چلے جاتے۔ مولاناؒ، سابق مہتمم: حضرت مولانا سعید بزرگؒ کو اپنے ساتھ لے کر اُن طلبہ کی تنبیہ کے لیے تشریف لے جاتے اور ایک ایک کو پکڑ کر اُن کی گوش مالی کرتے۔

اِس بات کی تائید حضرت مفتی فرید صاحب کاوی دامت برکاتہم کی ایک تحریر سے ہوتی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''دورِ نظامت میں مولاناؒ کی سادگی دیکھ کر بعض طلبہ یوں سمجھتے کہ انہیں کچھ خبر نہ ہوگی؛ اس لیے بستی میں یا قرب وجوار میں ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے چلے جاتے؛ مگر یہ شرارت مولاناؒ سے پوشیدہ نہ رہتی، سنیچر کو ایسے سب طلبہ کی بازپرس ہوتی اور تنبیہ فرماتے۔ ہاں نرمی اور شفقت کا مزاج رکھتے تھے اس لیے سخت

دار وگیر نہ ہوتی؛ بلکہ چھڑی کی دو چار ہلکی ضربوں پر ہی اکتفا فرماتے‘‘۔

امتحان ہال کے نظم ونسق کی بے نظیر خدمت

آپؒ کی خدمات کا ایک روشن باب امتحان ہال کی نظامت کا ہے۔ اِس ذمہ داری کو آپؒ نے جس حسن وخوبی اور منظّم طریقے سے انجام دیا ہے، اُس کا بیان میرے خامۂ شکستہ سے باہر ہے؛ مگر جتنا دیکھا اور سنا ہے وہ ٹوٹے پھوٹے پیرائے میں نذرِ قائین ہے:

ایک دور تھا جب امتحانات، جامعہ کی ’’مسجدِ قدیم‘‘ میں ہوا کرتے تھے، مستقل ہال کا کوئی نظم نہ تھا، جس کی وجہ سے امتحان شروع ہونے سے پہلے فجر کے بعد تپائیاں رکھوانے اور پھر امتحان کے بعد اُن کو اٹھوانے کے روزمرہ کے معمول میں اچھی خاصی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا؛ مگر آپؒ اِس سلسلے میں اِتنی بیدار مغزی سے کام لیتے کہ آنے والی پریشانیاں چٹکیوں میں حل ہوجایا کرتی تھیں۔

جب امتحان کا زمانہ آتا تو سب سے پہلے پورے امتحان کی ترتیب وتنسیق اور مختلف قسم کی چھوٹی بڑی ذمے داریوں پر مشتمل تحریری شکل میں ایک مفصل خاکہ تیار کرتے اور پھر اُس کے مطابق پورا نظام چلاتے۔

جن حضرات کے حوالے امتحان ہال کے تعلق سے جو ذمہ داری سپرد کی گئی ہوتی، آپؒ ہر ایک کے پاس فرداً فرداً رُقعہ لکھ کر بڑے عاجزانہ انداز میں اُس کی یاددہانی کرواتے، اتنا ہی نہیں؛ بلکہ وقتاً فوقتاً اُن کاموں کی تکمیل کے حوالے سے

باز پُرس بھی کرتے رہتے۔

امتحان شروع ہونے سے پہلے آپؒ چند مخصوص ہوشیار اور بیدار مغز طلبہ کو بلاتے اور مختلف کلاسوں سے تپائیاں جمع کرنے، نمبرات کی ترتیب لگانے اور جوابی کاپیاں رکھنے کے سلسلے میں باریک باریک ہدایات دیتے۔ اُس وقت اُن طلبہ سے فرماتے کہ: ''فجر کے بعد آپ لوگوں کو مسجد ہی میں رہنا ہے، آپ کے لیے چائے کا انتظام الگ سے کر دیا جائے گا، میں ناظمِ مطبخ سے کہلوادوں گا''۔ دوسرے دن اولِ وَہلے میں اُن طلبہ سے پوچھتے کہ: کل آپ لوگوں کو چائے ملنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی تھی؟ اسی پر بس نہیں؛ بلکہ اس کے بعد آپؒ کبھی خود مطبخ تشریف لے جاکر تحقیق کرتے کہ اُن طلبہ کو چائے ملی تھی یا نہیں؟ اگر نفی میں جواب ملتا تو پھر آپؒ اپنے مخصوص لہجے میں مطبخ کے ذمے داروں کی خیریت دریافت فرماتے۔

آپؒ خود طلبہ کے ساتھ مل کر تپائیاں لگاتے اور بد نظمی کو ذرا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ حُسنِ ترتیب کا یہ عالم تھا کہ آپؒ نے اپنے پاس بڑی، متوسط اور چھوٹی؛ تینوں سائز کی سلاخیں رکھی تھیں اور اُن کے ذریعے سے دو تپائیوں کے دائیں، بائیں اور درمیان کی جگہ کو ناپ ناپ کر تاکید کے ساتھ تپائیوں کو درست کرواتے تھے۔

آپؒ بہ ذاتِ خود صحت و مرض کی پرواہ کیے بغیر بلا ناغہ پابندی کے ساتھ امتحان ہال میں تشریف لاتے اور پورے امتحان ہال پر بہ یک وقت بڑے چوکنا

ہو کر اس طرح کڑی نظر رکھتے تھے کہ کسی طالبِ علم کی کیا مجال کہ وہ کوئی غیر قانونی حرکت کر سکے۔ اگر کسی موقع پر سخت بیماری کی وجہ سے آپؒ نہ آسکتے تو پہلے سے مستقل ایک درخواست لکھتے اور غایت عاجزی وانکساری کے انداز میں اِس طرح اطلاع دیتے جیسے کوئی مجرم اپنے جرم کی معافی کے لیے معافی نامے کی شکل میں درخواست پیش کر رہا ہو۔

اب آیئے! ذرا ادیبِ جامعہ حضرت مفتی عرفان صاحب مالیگانوی -حفظہ اللہ- کی زبانی اسے ملاحظہ فرمائیں:

''سب سے پہلا حضرتؒ سے ہمارا واسطہ عربی اول میں پڑا، گھنٹی کے پاس والی درس گاہ میں حضرت مولانا رشید احمد کیاتؒ ہمارے استاذ تھے۔ ششماہی امتحان قریب آیا تو اچانک حضرت مولانا یوسف صاحب کاویؒ درسگاہ میں تشریف لائے -ابھی امتحانات شروع نہیں ہوئے تھے- اور استاذ کی مسند پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ: ''قریب قریب آجاؤ!'' ہم سب اچنبھے میں پڑ گئے کہ مولانا تشریف لائے ہوئے ہیں! کیا بات ہے؟ اور اس کے بعد زوردار ہنسی کا فوارہ چھوٹا اور کہنے لگے کہ: ''وہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم کیوں آئے ہیں؟'' ممکن ہے کہ ہمارے بعض ساتھیوں کو پتہ ہو کہ مولاناؒ کیوں تشریف لائے ہیں، مگر مجھے تو پتہ نہیں تھا۔ پھر مولاناؒ نے کہا: ہم اس لیے آئے ہیں کہ ہر سال کا معمول ہے کہ امتحان کے وقت یہ ساری تپائیاں امتحان گاہ میں ترتیب سے لگانا؛ یہ کام اور یہ ذمہ داری اِس درس گاہ

کے طلبہ انجام دیتے آئے ہیں، تو کیا آپ لوگ بھی تیار ہیں؟ اس سال آپ لوگ تپائیاں لگانے کی یہ خدمت انجام دیں گے؟ چنانچہ ہم سب نے ہامی بھر لی، اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ فجر کی نماز کے بعد تلاوت سے فارغ ہو کر جب سارے طلبہ چائے پینے کے لیے چلے جاتے اُس وقت یہ طلبہ وہاں آ کر تپائیاں ترتیب سے لگا دیتے تھے، تو سارے طلبہ - جس میں مَیں خود بھی تھا - یہ سوچنے لگے کہ: یہ تو ایک قربانی ہے کہ ہم چائے چھوڑ کر مسجد میں تپائیاں لگائیں گے اور وہاں پہنچیں گے تو چائے بالکل ختم ہو چکی ہو گی، مولاناؒ نے خود بھی اِس بات کو محسوس کیا اور اس کے بعد بہت زور دے کر کے فرمایا کہ: ''گھبرائیے نہیں، وہ آپ کی چائے مطبخ میں علاحدہ رکھی جائے گی'' جتنے طلبہ تھے اُن کی گنتی کی اور کہا کہ: ''مطبخ میں آپ کی چائے علاحدہ سے نکال کر رکھی جائے گی، آپ کو پہلے تپائیاں لگانا ہے اور پھر آپ کو مطبخ میں جا کر چائے پینا ہے''۔

آپ یقین جانیے! کہ تمام طلبہ کے نکل جانے کے بعد ہم ایک درس گاہ کے طلبہ جو تپائیاں لگاتے تھے، اُس میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگتے تھے اور حضرت مولاناؒ خود بھی مسجد میں موجود رہتے تھے، کہ کس تپائی کو کہاں لگانا ہے، لکڑے والی تپائی، چھوٹی تپائی، بڑی تپائی، اِس کو یہاں لگائیے، چھوٹی کو یہاں لگائیے! پوری ترتیب بتلاتے تھے اور کبھی کبھی: ''اُس تپائی کو پیچھے کر دیجیے، وہ کونسی؟ جس کے پاؤں نہیں ہے'' بہت پیارے پیارے، میٹھے میٹھے جملے حضرتؒ

ارشاد فرماتے تھے۔

اس کے بعد جب تپائیاں لگانے کا عمل مکمل ہو جاتا تو ہم لوگ حضرتؒ سے کہتے کہ: حضرت! تپائیاں لگ گئیں۔ تو پھر آپ بے شمار دعاؤں سے نوازتے تھے کہ: ''اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کا امتحان آسان کرے، اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیابی عطا کرے''، یہ دعائیں ہم سنتے تھے تو دِل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اکثر دوسرے دن مولاناؒ سوال کرتے تھے کہ: ''وہ چائے پی تھی آپ نے کل؟ وہ چائے گرم تھی یا ٹھنڈی؟'' اِن ہی ایام میں چوں کہ امتحان کافی دنوں تک چلتا تھا، کبھی کبھار خود مطبخ میں تشریف لاتے اور دیکھتے کہ منتظمینِ مطبخ نے اِن طلبہ کے لیے چائے نکالی ہے یا نہیں نکالی ہے؟ اور ہمیں چائے پیتا ہوا دیکھتے تب مولاناؒ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں''۔

غرض آپؒ نے پوری زندگی اپنے اِس فرضِ منصبی کی ادائیگی میں کوئی کسر نہ چھوڑی، بے لوثی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے۔ اپنی زندگی کے آخری سال میں بھی مسلسل علالت کے باوجود حتی المقدور آپؒ امتحان ہال میں تشریف لاتے اور اپنی ذمہ داری کو اَحسن طریقے سے نبھاتے رہے۔

میدانِ تقریر وتحریر میں

آپؒ کوچۂ تقریر وتحریر کی پیچ در پیچ راہ داریوں سے بھی واقف تھے، آپ کا شہبازِ زباں بلند پرواز، اور سمندِ قلم سبک گام واقع ہوا تھا؛ لیکن آپؒ کی اِخفا

پسند طبیعت زبان وقلم کو شہرتِ عام دینے سے مانع رہی۔

آپؒ اپنے الفاظ و نقوش کو عملی و شستگی کا زیور پہنا کر طاقچۂ قرطاس کی زینت بناتے اور گل ہائے پند وموعظت کے رخسار پر دل کشی وجاذبیت کا غازہ چڑھا کر سامعین کے حضور پیش کرتے اور سامعین بڑی خوشی ومسرت کے ساتھ اُنھیں گلدستۂ قلب میں سجاتے۔ آپؒ اپنے بیان میں بارہا یہ جملہ کہا کرتے تھے کہ: ''ظاہری اسباب کی انتہا؛ باطنی اسباب کی ابتدا ہے''، اِس جملے سے آپؒ کے ایمان ویقین کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آپؒ کی اِخفا پسند طبیعت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپؒ کی کوئی قلمی تحریر بہ شکلِ تصنیف ہمارے سامنے نہ آسکی؛ البتہ آپؒ کا قلمِ گہربار کس پائے کا تھا اِس کا اندازہ لگانے کے لیے میں ایک تقریظ- جو آپؒ نے ''خطباتِ محمود/ جلد رابع'' (از حضرت مفتی محمود بارڈولی دامت برکاتہم) پر لکھی ہے- نقل کیے دیتا ہوں:

تمام تعریفیں اُس خالقِ لوح وقلم کے لیے ہیں جس نے انسان کو قوتِ نطق وگویائی عطا فرمائی اور لاکھوں درود وسلام ہو اُس نبیٔ امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جس کو خود خالقِ نطق وگویائی نے فصاحت وبلاغت کے بلند ترین مقام سے سرفراز فرمایا اور کروڑوں رحمتیں ہوں اُن پاک نفس بندگانِ باصفا و مردانِ راہِ خدا پر جن کے وعظوں اور تقریروں، بیانوں اور خطبوں نے ہر دور میں امتِ احمدیہ کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھا، جن کی شعلہ بیانی وگرم نوائی نے لاکھوں قلوب میں زندگی کی لہر دوڑا دی،

جن کے گرم گرم نفَس سے بے شمار کُشتہ ومردہ شمعیں جل اُٹھیں:

جلا سکتی ہے شمعِ کُشتہ کو موجِ نفَس اُن کی
اِلٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ قوموں اور ملکوں کی انقلابی تاریخ میں وعظ وخطابت کا نمایاں رول رہا ہے، اسلامی تاریخ میں صرف عہدِ نبوت پر ایک نظر ڈالیے، سیکڑوں واقعات مل جائیں گے، جن کے پسِ پشت خطابت کا جوہر کارفرما ہوگا: چاہے کوہِ صفا کی وادی ہو یا نجاشی کا دربار، طائف کی گلیاں ہوں یا عکاظ وذو المجنہ کے بازار، بدر وحنین کی سرزمین ہو یا موتہ کا معرکۂ کارزار، مدینہ کے شب وروز کے انقلابی مواعظ ہوں یا حجۃ الوَداع کا رخصتی پیغام؛ ہر جگہ وعظ وخطابت کی سحر بیانی وطلسم طرازی کا کردار صاف نظر آئے گا۔ خطابت کی اِسی اہمیت واِفادیت کی بنا پر افصح اللسان پیغمبر علیہ السلام کی لسانِ گوہر فشاں سے یہ زرّیں جملہ نکلا: ''إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا''۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُسوہ پر صحابۂ کرامؓ، اور صحابہؓ کے مقدس کارواں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے امتِ محمدیہ میں لاتعدّ ولاتحصیٰ بندے ایسے گذرے ہیں جنھوں نے وعظ وخطابت کے ذریعے دلوں کو گرمایا، آنکھوں کو نرمایا اور زندگیوں کو بدلوایا۔

مجھے نہایت خوشی وفخر ہے کہ اِن پاک طینت بزرگانِ باصفا کی صف میں

عزیز القدر مفتی محمود صاحب بارڈولی زید مجدہ وفضلہ (استاذِ تفسیر وفقہ جامعہ ڈابھیل) بھی شامل ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ موصوف شیریں بیاں خطیب ومقرر ہیں، زمانۂ طالبِ علمی ہی سے اِس میدان کے شہ سوار بنے ہوئے ہیں، ان کی شعلہ نوا خطابت اور رقت آمیز مواعظ کا شہرہ گجرات کے دیہاتوں سے لے کر برطانیہ اور بارباڈوس کے شہروں تک ہے۔ غیروں کا مجمع ہو یا اپنوں کا ہجوم، سیاسی اسٹیج ہو یا روحانی منبر، اصلاحی مجالس ہو یا درسِ تفسیر، جنگِ آزادی کا گرم گرم موضوع ہو یا دعوت وتبلیغ کا سادہ ودل سوز تذکرہ؛ اِن میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ان کے خطابت کا رنگ نہیں جمتا۔ یہاں خطاب شروع ہوا اور وہاں آنکھیں نم اور دل پُرغم، مجلس ختم ہوئی اور لوگ چشمِ گریاں اور قلبِ بریاں کے ساتھ اُٹھے اور کیا ہی اچھے اُٹھے، کہ زندگی بدل دینے کا فیصلہ کر اُٹھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک دنیا ان کے فیضِ خطابت سے مستفیض ہو رہی ہے۔

ضرورت تھی کہ عزیز موصوف کے مواعظ وبیانات کو کتابی شکل میں شائع کر کے ان کے افادے کو عام وتام کیا جاتا۔ بے حد خوشی کی بات ہے کہ ان کے زریں مواعظ وبیانات سلسلہ وار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے۔ عزیز موصوف کا اِصرار تھا کہ میں بھی اِس پر چند کلمات تحریر کر دوں۔ ماشاء اللہ ان کے مواعظِ حسنہ کو دیکھا،

پڑھا، بہت ہی جامع ونصیحت آموز، پرسوز وبا اثر اور قابلِ عمل پایا۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ قارئین کو اِس سے از حد فائدہ پہنچائیں، ذریعۂ نجات بنائیں، عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور عزیز القدر موصوف کو مزید دینی علمی اصلاحی اور ملّی خدمات کی توفیق وسعادت عطا فرمائیں۔ آمین بجاہ سید المرسلین

دعا گو ودعا جو:

یوسف احمد الکاوی المظاہری غفرلہ

مقیم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، نوساری گجرات

۱۴/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

''عزائم'' کی سرپرستی

آج سے تقریباً پانچ یا چھ سال پہلے جامعہ میں معصوم نونہالوں کی قلمی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے بہ نام ''عزائم'' ایک قلمی جولان گاہ (بہ صورتِ جداری پرچہ) کا قیام عمل میں آیا، جس کی سرپرستی روزِ اول ہی سے آپؒ کو حاصل رہی، آپ ہمیشہ پُرخلوص دعاؤں سے اس کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں رہے۔ استاذِ مرحوم ہی کی سرپرستی میں رہ کر اِس ''عزائم'' نے جو عزائم طے کیے تھے، آج ۔بحمد للہ۔ اُن کی تکمیل میں ایک حد تک کامیاب نظر آرہا ہے اور ہر سال اپنے پلیٹ فارم سے نونہالوں کی قلمی کاوشوں کو سال نامے کی شکل میں شائع کررہا ہے۔ آج بے شک استاذِ محترم نہیں رہے؛ مگر آپ کی حوصلہ افزائی، توجہات اور

دعاؤں سے ننھے منے بچوں کی جو فوجِ ظفر موج تیار ہوئی ایک دنیا اس کی گواہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرۃ الاستاذ کی وفاتِ حسرت آیات پر عزائم کے آٹھ خصوصی شمارے منظرِ عام پر آئے، سچ ہے:

دستِ معصوم میں وہ لوح وقلم دیتا ہے
نونہالوں کو وہ قندیلِ حرم دیتا ہے
بانٹتا پھرتا ہے روشنی سورج کی طرح
ڈوب جاتا ہے تو تاروں کو جنم دیتا ہے

احساسِ ذمے داری

انسان-خواہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو اور دنیا کا کوئی بھی شعبہ چلاتا ہو-جب تک اپنے اندر ''احساسِ ذمے داری'' کا وصف پیدا نہیں کرتا، وہاں تک وہ اپنی ذمے داریوں کو احسن طریقے سے نبھا نہیں سکتا، اور اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں کامل اور مکمل نہیں سمجھا جاسکتا ہے، چاہے وہ اپنے عزائم اور حوصلوں میں ہمالیہ کی چوٹیوں سے باتیں کرتا ہو اعرشِ معلّٰی کا خواب دیکھتا ہو؛ مگر اُس کا وہ کام ہمیشہ تشنہ لب ہی رہ جاتا ہے، کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا۔

ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کو دیکھنے اور برتنے کے بعد اِس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کے اندر یہ وصف ایسے کامل اور اتم درجے میں ودیعت فرما رکھا تھا کہ جامعہ میں صفِ اول کے وہ

حضرات جن کو اپنی ذمے داری کا احساس ہے، اُن میں آپؒ کی شخصیت انتہائی ممتاز اور بڑی نمایاں نظر آتی ہیں۔

جیسا کہ ماقبل میں ہم نے مولاناؒ کے نظامتِ امتحان کے سلسلے میں کچھ کارگزاری سنی، اب ذرا مفتی ابوبکر صاحب مدظلہ العالی کی زبانی اسے ملاحظہ فرمایئے:

''مولاناؒ اِس نظامتِ امتحان کے سرپرست تھے، آپؒ نے خدام کی حیثیت سے ہمیں بھی اس میں جوڑ دیا تھا؛ لیکن نہایت ہی عبرت کی بات ہمارے لیے یہ ہے کہ مولاناؒ ہم سے زیادہ کام کرتے تھے اور خود پوری تیاری کر لیتے تھے، پھر کام مکمل ہونے کے بعد فرماتے کہ: ''مولانا! ذرا دیکھ لیجیے گا، تپائیاں اچھی طرح لگی ہیں یا نہیں؟''

اسی طرح ہمارے جامعہ میں انتظامی امور کی سہولت کے لیے امتحانات کے پرچوں کو تقسیم کرنے کے سلسلے میں ایک ضابطہ بنا گیا ہے کہ جس استاذ کی کتاب ہو وہ خود اُس کا پرچہ تقسیم کرے گا۔

بہ ظاہر یہ ہے تو ایک چھوٹا سا کام؛ لیکن آپ اندازہ لگایئے کہ امتحانات کے موقع پر اگر کسی انتہائی معذوری کی بنیاد پر- جو شاید و باید کبھی ہو- غیر حاضر رہے یا اپنی مجبوری و معذوری کی وجہ سے اپنا پرچہ تقسیم نہ کر پاتے، تو بڑے اہتمام سے ایک پرچی انتہائی عاجزانہ و متواضعانہ انداز میں- جس میں چھوٹوں سے اِس انداز کا خطاب و القاب ہوتا تھا کہ وہ شرما کر پانی پانی ہو جاتا- لکھ دیتے کہ: ''مولانا!

آئندہ کل میری فلاں فلاں کتاب کے پرچے ہیں، اُن میں ایک آپ کو تقسیم کرنا ہے، دوسرا پرچہ قاری رضوان صاحب تقسیم کریں گے“۔

ابھی ششماہی سے پہلے مَیں سفر پر گیا تھا، بدھ کے دن سفر سے واپس آیا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ جمعرات کے دن پرچہ تو ہے؛ لیکن دوپہر میں ہے اور عام طور پر دوپہر میں چوں کہ ایک دو کتابیں ہوتی ہیں، تو چند اساتذہ سے کام چل جاتا ہے؛ اس لیے باقاعدہ اس میں حاضری کا خیال رکھا جائے؛ اِس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ مَیں جیسے ہی بدھ کے دن دوپہر کے وقت پہنچا ہوں، عزیزم حسان دیولوی شام کے وقت ایک پرچی لے کر آئے اور پرچی میں مولاناؒ نے اپنے معمول کے مطابق اَلقاب لکھے اور اس کے بعد لکھا کہ: ”آئندہ کل صبح فلاں فلاں کتاب کا پرچہ ہے اور شاید دوسرے نگران آئے نہ آئے؛ لیکن آپ کو وہاں جانا ہے اور یہ پرچی قاری رضوان صاحب کو بھی پڑھوا دینا“۔ چنانچہ میں نے وہ پرچی ایک طالبِ علم کے ہاتھ قاری صاحب کی خدمت میں بھی پیش کی تھی۔

آپ اندازہ لگائیے کہ- آدمی کو اپنے کام کے لیے بھی اتنی فکر نہیں ہوتی، اتنا چھوٹا سا کام کہ کبھی اُس کی طرف ذہن بھی نہیں جاتا- آپؒ کے اندر احساس ذمے داری کا وصف کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا!“۔

بلبلوں کو یاد آجائے گی رودادِ بہار
دل کو تڑپائے گی اے نیّر! غزل خوانی تیری

بابِ دوم

اوصاف وکمالات

آپؒ کا سراپا

متوازن ومتوسط فربہی جسم، دراز قدوقامت، سر پر منکسر المزاج دوپلی ٹوپی، داغہائے چیچک کے باوجود پُرکشش نورانی چہرہ، ہشاش بشاش مکھڑا اور اُس پر معصومیت کا نکھار، پیشانی کسی قدر چوڑی، آنکھوں پر لگی ہوئی سنہری عینک ـــــ، گھنیری بھنویں، اُبھری ہوئی کھڑی ناک، سفید گھنی دراز رِیش، جسم پہ کشادہ کرتا اور سادی سی ازار یا تہہ بند، ہاتھ میں عصا اور پاؤں میں جسامت کے مناسب نعلین، خراماں خراماں سی باوقار زاہدانہ چال، گفتگو میں شبنم کی ٹھنڈک اور قندونبات کی مٹھاس، مجلسِ درس وتقریر اور نجی محفل میں دلوں کو رُلانے اور آنکھوں کو نَم کرنے والا سوزوگداز، اینچ پینچ سے پاک صاف اور شفاف گفتگو، پیاری آواز اور بے پناہ اپنائیت کا رَویہ، مسحور کردینے والا لہجہ، آب وہَوا سے زیادہ آسانی سے مُیسّر آجانے کی ادا، پھلوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح ہر چھوٹے بڑے انسان کے لیے اُن کی خمیدگی وخندہ روئی؛ اِن شمائل وخصائل کو ترتیب دینے کے بعد شخصیت کی جو تصویر ذہن میں اُبھرے، اُس پر لکھ دیں ''یوسف احمد کاویؒ''۔

عبادات کی چند جھلکیاں

فرمانِ الٰہی: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ اور اِرشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: ''إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ'' کے پیشِ نظر بنی نوعِ آدم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دنیوی نقش ونگار اور اس

کی رنگینیوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے ہمہ وقت آخرت کی تیاری میں لگا رہے۔ چنانچہ اللہ کے محبوب ومقبول بندے ہمیشہ اپنے آپ کو اِسی فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگائے رکھتے ہیں؛ تاکہ دنیا وآخرت کی کامیابیوں سے ہم کنار ہو کر دونوں جہاں میں سرخرو ہوں۔

ان ہی فرشتہ صفت بندگانِ خدا کے قافلے کے ایک رہ رَو ہمارے استاذِ محترم مولانا یوسف صاحب کاویؒ کی ذاتِ گرامی بھی تھی۔ تو آیئے! ذرا آپؒ کی عبادات کی چند جھلکیوں کو اجاگر کریں:

خدا تعالیٰ نے بچپن ہی سے آپؒ کے اندر عبادت وریاضت کا شوق وذوق ودیعت فرما رکھا تھا۔ ماقبل میں آچکا ہے کہ آپؒ کا اصلاحی تعلق اولاً شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے ساتھ تھا؛ اسی لیے آپؒ زمانۂ طالبِ علمی ہی میں سالانہ تعطیلات کے موقع پر تبلیغی جماعت سے لوٹ کر رمضان کے آخری عشرے کے اعتکاف کے لیے حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہیں رہ کر ذکرواذکار اور عبادت وریاضت میں وقت گزارتے تھے۔

نماز سے متعلق آپؒ کی پابندی کا حال

آپؒ کی سب سے امتیازی خصوصیت صفِ اولیٰ کی پابندی تھی۔ عمر بھر آپؒ کا یہ معمول رہا کہ پنج وقتہ نمازیں- چاہے کتنا ہی بڑا مجمع کیوں نہ ہو- صفِ اُولیٰ میں بالکل امام کے پیچھے ادا فرماتے۔ آپؒ کا معمول اذان سے پہلے ہی مسجد

آنے کا تھا، ضعیف العمری کے باوجود عموماً آپؒ پیدل ہی اپنی دھیمی دھیمی چال سے چل کر مسجد تشریف لاتے، اور آکر کبھی تلاوتِ کلام پاک میں تو کبھی ذکر واذکار میں، کبھی مراقبے میں تو کبھی دعاؤں میں مشغول رہتے۔

اعضا واعصاب میں ضعف وکم زوری، مختلف امراض واسقام کی حملہ آوری، بالخصوص عرق النساء کی بیماری کے باوجود آپؒ پنج وقتہ نمازوں میں حاضر ہوکر صفِ اولیٰ میں نماز پڑھنے کے اِس قدر پابند رہے کہ اگر کسی دن مسجد پہنچنے میں تاخیر ہوجاتی، تو آپؒ کے انتظار میں دروازے کی طرف طلبہ کی ٹکٹکی بندھ جاتی، یکا یک آپؒ نمودار ہوتے۔ اُس وقت پھولتی سانسوں اور ٹپکتے پسینہ کے باوجود جس تیز رفتاری کے ساتھ آپؒ صفِ اولیٰ کی طرف قدم بڑھاتے، اُسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا کہ کسی ہاتفِ غیبی نے صفِ اولیٰ کے سربستہ ثوابوں کو آپؒ کے سامنے وَا کردیا ہے، جس کے شوق میں آپؒ چپ وراست سے بے خبر منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ آپؒ نوافل کے بھی بڑے پابند تھے، آخری عمر بلکہ زندگی کے آخری لمحے تک تہجد گذار وشب بیدار رہے؛ اوّابین، اشراق اور چاشت کی نماز ادا کرنا زندگی بھر کا معمول رہا۔

وظائف کی پابندی

جیسا کہ آپ نے ماقبل میں پڑھا کہ بیعت وارشاد کا تعلق قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے تھا اور چوں کہ سلسلے کے

وظائف کی پابندی ایک سچے سالک کے لیے نہایت ضروری ہوا کرتی ہے؛ مگر حضرتؒ کے ذمے تدریسی خدمات کی انجام دہی بھی تھی؛ اس لیے آپ بسا اوقات تنگیٔ وقت کے سبب بعض وظائف کی تکمیل سے معذور تھے؛ مگر دِل میں اِس کی کڑھن رہ رہ کر ستاتی تھی۔

چنانچہ اِس بے قراری اور معذوری کی تلافی کے لیے آپؒ نے اپنا معمول کچھ اِس طرح بنایا تھا کہ جب شعبان المعظم میں سالانہ چھٹی ہو جاتی، تو صرف ایک وقت: مغرب سے لے کر عشا تک اپنے اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی کے لیے متعین کر لیتے تھے، باقی تمام اوقات مسجد میں گوشہ نشیں ہو جاتے؛ یہاں تک کہ اسبابِ استراحت (بستر وغیرہ) بھی مسجد ہی میں منگوالیتے اور اپنے باقی ماندہ وظائف کی تکمیل فرماتے اور یہ تو ایامِ تعلیم میں بھی بارہا دیکھا گیا کہ آپؒ عصر سے مغرب تک کا وقت مسجد میں ہی تشریف رکھتے اور ذکر وشغل میں مصروف رہتے۔

خدا کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریہ بھی پھر تختِ سلیمانی تھا

قرآنِ مجید سے لگاؤ

آپؒ اگرچہ باقاعدہ حافظِ قرآن نہیں تھے؛ لیکن قرآنِ کریم کی کثرتِ تلاوت اور اس کے تفسیری مطالعے کی وجہ سے قرآنِ کریم ایسا اَزبر ہو گیا تھا کہ آپؒ کے صاحب زادے کا بیان ہے: جس وقت ہم لوگ قرآن کریم کی تلاوت کر

رہے ہوتے اور اتفاقاً کسی جگہ غلط پڑھ بیٹھتے، تو والد صاحبؒ ہمارے سامنے فوراً اُس غلطی کی نشاندہی فرما دیتے۔

حضرت قاری محمد رضوان صاحب پالنپوری مدظلہ فرماتے ہیں کہ: آپؒ کو قرآنِ کریم سے حد درجہ لگاؤ تھا، جب تک حضرتؒ کی صحت رہی ''لجنۃ القرا'' کی تمام مجالس میں تشریف لاتے اور شرکت فرماتے رہے۔ اس کے بعد جب طبیعت نے ساتھ دینا چھوڑ دیا اور حضرتؒ اکثر علیل رہنے لگے، اُن دِنوں ایک سال مسابقے کی تمام مجالس میں شرکت فرمائی، تو دوسری یا تیسری مجلس کے بعد حضرتؒ اسٹیج پر تشریف فرما تھے، میں گیا، اور کہا کہ: حضرت! اتنی نقاہت کے باوجود آپ تشریف لائے اور ہماری حوصلہ افزائی فرمائی، میں بہت ممنون و مشکور ہوں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، اللہ آپ کو صحت عنایت فرمائے۔ حضرتؒ نے آمین کہنے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ: ''مولانا! شکریہ کہاں؟! یہ تو اپنا مدرسہ ہے، ہماری ذمہ داری ہے''۔ دیکھیے! بُڑھاپے میں بھی حضرتؒ کا یہ احساس اور یہ ذوق وشوق ہے۔

حجازِ مقدس کا سفر

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو دیگر عبادات کی توفیق عطا فرمائی تھی، وہیں اپنے گھر کی زیارت کے شرف سے بھی نوازا تھا۔ آپؒ نے اپنی زندگی میں پانچ مرتبہ فریضۂ حج ادا کیا اور سات یا آٹھ مرتبہ عمرہ کی غرض سے حاضری کا موقع ملا۔

۱۹۹۱ء میں پہلا حج فرمایا، جس میں اولاً فقیہ الامتؒ کی خدمت میں رہے،

پھر ان کے تشریف لے جانے کے بعد اکابر تبلیغ کے کارواں میں شامل ہو گئے، اور عبادت کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ایک حج کے موقع پر آپؒ کو سخت دشوار گزار حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ ہوا یوں تھا کہ: اس سفر میں آپؒ کا تمام مال واسباب گم ہو گیا، نوبت بہ ایں جا رسید کہ عینک، پاسپورٹ اور دیگر سامان گم شدگی کی نذر ہو گئے؛ لیکن آپؒ اِس بات سے بالکل آزردہ خاطر نہ ہوئے؛ بلکہ بہ صد خوشی ومسرت اللہ کے حضور شکر ادا کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اِن حالات کی بنا پر دیارِ مقدس میں دیر تک رہنا مقدر فرمایا۔

رمضان المبارک کے مسلسل چار عمروں میں آپؒ کی کیفیت

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریباً سات یا آٹھ عمرے کی سعادت سے سرفراز فرمایا تھا، ان میں سے چار عمرے مسلسل آپ نے رمضان المبارک میں ادا فرمائے۔ ان چار سال کے عمروں میں حرمین کے قیام کے دوران استاذِ محترم کا کیا معمول رہا؟ اور کیا کیفیت رہی؟ اُس کو جامعہ ہی کے ایک فاضل اور آپؒ کے خاص شاگرد حضرت مفتی رفیق کوکنی مدظلہ العالی، جو ان دنوں مدینہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور جنھوں نے ان چار سالوں میں آپؒ کی دل وجان سے خوب خدمت کی اور آپؒ کو انتہائی قریب سے دیکھا، وہ خود اِس کی روئیداد بیان کرتے ہیں کہ:

”استاذِ محترم مولانا یوسف صاحب کاوی کا پہلی مرتبہ دیدار اُس وقت ہوا جب بندے کا جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں داخلہ ہوا اور عربی سوم سے دورۂ حدیث

تک مولانا سے مختلف اسباق پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل سے فراغت کے بعد اللہ کے فضل اور اساتذہ کی دعاؤں سے بندہ مدینۃ المنورۃ میں عالمی درس گاہ مدینہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا، تو اُس زمانے میں رمضان المبارک میں مولاناؒ عمرے کی غرض سے حرمین تشریف لاتے۔ جب سفری امور مکمل ہو جاتے اور ہمیں اطلاع مل جاتی کہ مولانا تشریف لا رہے ہیں، تو ہماری خوشی دوبالا ہو جاتی؛ اس لیے کہ ایک طرف استاذِ محترم کے نورانی چہرے کے دیدار کا اِشتیاق، تو دوسری طرف استاد کے ساتھ حرم میں وقت گزارنے کا موقع ہاتھ آ جاتا۔

میرے تعلیمی چار سالوں میں مولاناؒ ہر سال رمضان میں تشریف لائے؛ گویا مولاناؒ کے ساتھ چار رمضان گزارنے؛ بلکہ مولاناؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع میسر آیا۔

مولانا اور حرم

مولاناؒ عمرے سے فراغت کے بعد پورا وقت حرم ہی میں گزارتے تھے، پنج وقتہ نماز حرم ہی میں ادا کرتے۔ اکثر اوقات تلاوت میں مصروف رہتے، آپ کی عبادت میں انہماک وشوق اور جذبے کو دیکھ کر میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ اللہ کا ولی بڑھتی عمر میں بھی اللہ کو راضی کرنے کے لیے کس قدر اپنے آپ کو تھکا رہا ہے اور اپنی جوانی پر افسوس ہوتا کہ باوجود قُویٰ مضبوط ہونے کے بھی عبادت میں وہ شوق اور انہماک نہیں پایا جا رہا ہے؛ البتہ مولاناؒ کو دیکھ کر ایک قسم کا جذبہ پیدا

ہو جاتا کہ اپنے اوقات کو حرم میں مکمل طور پر عبادت، ذکر و اذکار، تسبیح و تہلیل، تلاوتِ قرآن اور نوافل میں صرف کرنا چاہیے۔ اِسی جذبے کا اثر اور مولاناؒ کی برکت ہے کہ جب بھی حرمین جانا ہوتا ہے، مولاناؒ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی مشق اور تمرین اپنا کام کرتی ہے۔

مولاناؒ کی سحری و افطاری

رمضان المبارک چوں کہ برکت والا مہینہ ہے، جس کا اَثر اِفطار و سحر میں بھی نظر آتا ہے۔ مولاناؒ کی سحری و افطاری کو دیکھ کر کتابوں میں پڑھے ہوئے اَسلاف کے واقعات آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے۔ انتہائی سادگی کے ساتھ اور کم وقت میں سحری و افطاری کی سنت سے فارغ ہو جاتے۔ حرمین میں کچھ کھجوریں افطار کے وقت دست یاب ہو جاتیں، وہ چند کھجوریں ہی آپؒ کی کل افطاری اور رات کا طعام ہوتا اور سحری میں بھی صرف ایک روٹی تناول فرماتے۔ آج بھی رمضان المبارک میں سحری و افطاری میں مولاناؒ کا انوکھا اور نرالا انداز یہ پیغام دیتا ہے کہ: ''روزہ حقیقی معنی میں ابتدا سے انتہا تک نفس کی چاہت کے خلاف کام کرنے کا نام ہے''۔

حرم سے واپسی

عام طور پر زائرینِ حرم واپسی میں اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال کے لیے اپنی طاقت کے بقدر کچھ اشیا خرید ہی لیتے ہیں؛ لیکن مولاناؒ کو ہم نے ہمیشہ دیکھا

کہ مولاناؒ کبھی بھی کسی چیز کی خریداری کا اشتیاق نہیں رکھتے؛ بلکہ آپؒ کا اصل توشہ اور شاپنگ: معرفتِ ربّانی، عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں اضافہ ہوتا؛ البتہ وہاں کی متبرک اشیا: کھجور اور زمزم ضرور ساتھ لیتے۔ اِس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے آپؒ کو دنیا سے کس قدر بے رغبتی اور زہد عطا فرمایا تھا۔ نیز مولاناؒ کا یہ عمل ہمیں سبق دیتا ہے کہ سفرِ حرمین کا اصل مقصد خریداری نہیں؛ بلکہ کچھ اور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ کے انتقال کے بعد دورانِ تعلیم گذرے ہوئے اوقات کا لمحہ لمحہ یاد آنے لگا؛ لیکن اس سے زیادہ وہ چار رمضان بہت یاد آئے، جو مولاناؒ کے ساتھ حرمین میں گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ مولاناؒ کی مغفرت فرمائے اور مولاناؒ نے اپنی زندگی میں جن اوصاف اور کمالات سے ہمیں متأثر کیا، اُنھیں اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (حضرت مفتی رفیق پور کر کوکنی مدنی مدظلہ العالی کا کلام پورا ہوا)

طواف سے متعلق ایک عجیب واقعہ

جس وقت آپؒ عمرے کی غرض سے مکۃ المکرمہ میں مقیم تھے، عین اُسی موقع پر آپؒ کے والدِ گرامی کی وفات ہوگئی، جو اس وقت ''انگلینڈ'' میں اقامت پذیر تھے۔ یہ خبر جب آپؒ کے کانوں تک پہنچی، تو آپؒ نے اپنے والدِ محترم کے ایصالِ ثواب کے لیے تین دن میں اسّی طواف ادا فرمائے!!۔

والدین کے ساتھ برتاؤ

حضرت الاستاذؒ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ تنخواہ کبھی گنتے نہیں تھے اور فرماتے تھے کہ: ''گنو مت؛ ورنہ برکت ختم ہو جائے گی، بغیر گنے ہوئے اُس کو استعمال میں لاؤ، اللہ اس سے بڑھ کر دیں گے''۔

ایک مرتبہ آپؒ دفترِ محاسبی سے تنخواہ لے کر باہر نکلے اور حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی کو بلایا اور تین سو روپے اُن کے ہاتھ میں دیے (خیال رہے کہ یہ قدیم زمانے کے تین سو روپے کی بات ہے) اور یہ اِرشاد فرمایا: ''جاؤ! میری والدہ کو پہنچا کر آؤ، ہاتھ میں دے کر آنا، پہلے وہاں دے آؤ، پھر میں اِس کو استعمال کروں گا''۔ اُس زمانے میں حضرتؒ کے والدین مدرسہ کے باہر جہاں اِس وقت ''مکتبۂ اِدارۃ الصدیق'' ہے وہاں قیام پذیر تھے۔

اپنی اولاد پر پدرانہ شفقت

آپؒ نے کبھی اپنے بیٹوں کو زبردستی کسی فیصلے کے ماننے پر مجبور نہیں کیا اور ان کے ہاتھوں سے اختیارات کی کنجیاں سلب نہیں کیں۔ آپؒ کے پسرِ محترم حضرت قاری سعید صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ: میں نے عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم حفظ کیا، تکمیلِ حفظ کے بعد والدِ بزرگوار نے مجھے بلا کر اِرشاد فرمایا کہ: ''دیکھو! اب آپ عالمیت کے زینہ پر قدم رکھ چکے ہو اور آپ کے دوشِ ناتواں میں ایک ساتھ عالمیت اور عصری تعلیم کا بارِ گراں اٹھانے کی طاقت نہیں؛

لہٰذا اب اگر آپ چاہو تو دینی تعلیم کے سرسبز وشاداب گلستاں کے خوشہ چیں بنو، یا دنیوی تعلیم کے جہالت آگیں چراغ کا پروانہ، میں اِس سلسلہ میں تم پر کسی قسم کا جبر ودباؤ ڈالنا نہیں چاہتا''۔ والد صاحب کی اسی فہمائش، حسنِ اعتماد اور دردِ دل نے مجھے دینی تعلیم کے حصول پر آمادہ کیا۔

مسنون دعاؤں کا اہتمام

احادیثِ مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق موجود ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: ''كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَذْكُرُ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ'' آپ علیہ الصلاۃ والسلام ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے تھے۔ نیز خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے: ''لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ'' کہ تمھاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر وتازہ رہنی چاہیے۔

حضرت الاستاذؒ کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتباعِ سنت کا ایسا جذبہ ودیعت فرما رکھا تھا جس کے نشے میں آپؒ ہر وقت مخمور نظر آتے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا آپ ہر موقع پر، خصوصاً احوالِ متواردہ میں مسنون دعاؤں کا بڑی کثرت سے اہتمام فرماتے تھے۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: ''ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے دوست مولوی منصور جو اُس وقت ڈابھیل کے قریبی گاؤں ''آسنا'' میں مدرس تھے۔ کسی کے گھر دعا کروانے کے لیے حضرتؒ کو آسنا لے

گئے، انہوں نے سنایا کہ: واپسی میں حضرتؒ کو رِکشا کے ذریعے لے کر آیا، ''آسنا'' سے رِکشا میں بیٹھے اور آسنا سے لے کر ڈابھیل کے چوراہے تک - جو جامعہ کے بالکل قریب ہے، جہاں پہلے ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا - احادیث کے اندر سفر سے متعلق جتنی دعائیں الگ الگ روایتوں میں آئی ہیں، تمام دُعائیں حضرۃ الاستاذ نے پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے استاذ سے کہا کہ: ''استاذ جی! اب سفر ختم ہو گیا، ڈابھیل آ گیا، اب دعائیں بند کر دیجیے''۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک موضوع پر مختلف دعائیں آپؒ نے یاد کر رکھی تھیں اور اُن کا بڑا اہتمام بھی فرماتے تھے''۔

اِمسال (۲۰۱۶ء) ''مسلم شریف'' کے درس میں جب تہجد کا بیان آیا تو چونکہ مسلم شریف میں حضرت امام مسلمؒ نے اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق الگ الگ سندوں اور الگ الگ طرُق سے تہجد کے وقت اٹھنے کے موقع کی مختلف دعائیں ذکر کی ہیں۔ جب راقم الحروف عبارت خوانی سے فارغ ہوا تو مولاناؒ فرمانے لگے کہ: ''یہاں جتنی دعائیں ہیں تمام کو ایک پرچی میں لکھ لو، اور اِن کو پابندی کے ساتھ روزانہ تہجد کے وقت اُٹھ کر پڑھنے کا اہتمام کرو، ان شاء اللہ اِس کی بڑی برکت ظاہر ہوگی''۔ اور پھر ترغیب دِلانے کے لیے آپؒ نے اُس وقت مختلف مواقع کی الگ الگ کئی کئی دُعائیں سنائیں اور پھر فرمایا کہ: ''اِن کو پڑھنے کا اہتمام کرتے رہو، آج کل طلبہ دُعاؤں سے بہت غفلت برتتے ہیں، دُعاؤں کا

اہتمام نہیں کرے، دُعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے‘‘۔

دعا کرنے کا معمول

ترمذی شریف کی حدیث ہے: ’’مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فَقَدْ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ‘‘ جس کو دعا کی توفیق مل گئی اُس کے لیے رحمتِ خداوندی کے سارے دروازے کھل گئے۔

استاذِ محترم کے دعا کا جو نرالا انداز، پیارا اُسلوب، اور انوکھا لب ولہجہ تھا اُس کو الفاظ کا رُوپ نہیں دیا جاسکتا، آپؒ بہت ہی جھوم جھوم کر بڑے ہی کیف ووجد کے ساتھ دعا کرتے تھے۔ سالِ گذشتہ ’’مشکوٰۃ شریف‘‘ کے اختتام پر جامعہ کی مسجد میں آپؒ نے جو دعا فرمائی، شاید ہی کوئی طالبِ علم ایسا ہوگا جس کی ہچکیاں نہ بندھی ہوں، سب کی آنکھیں تر، ہر ایک نم دیدہ اور آنسوؤں کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں۔

حضرت مفتی ابوبکر صاحب پٹنی -دامت برکاتہم- فرماتے ہیں کہ: ’’دعا کے سلسلے میں آپؒ کا عجیب معمول تھا، مجھے یاد ہے، تقریباً دس بارہ سال ہو گئے ہوں گے، رمضان المبارک میں بندہ قدیم مسجد کی ’حی علی الفلاح‘ کی جانب صفِ اول میں مولاناؒ کے پڑوس میں بیٹھا کرتا تھا، مولاناؒ نماز سے پہلے اپنی دعا میں مشغول رہتے اور دعا میں اتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے، مثلاً یہ کہ: اے اللہ! فلانے کا سفر یہاں سے یہاں تک کا آسان کر دے۔ اے

اللہ! وہاں سے اُس کی جو گاڑی ہے وہ گاڑی کسی طرح چھوٹنے نہ پائے، پھر جو ہوائی جہاز ہے وہ چھوٹنے نہ پائے...... پورا بالترتیب مانگتے اور چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتے تھے"۔

آپ کے دعا کرنے کا جو معمول تھا، اُس کو آپؒ کے ایک شاگرد حضرت مفتی فرید صاحب کاوی مدظلہ العالی اپنے الفاظ میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"دعا کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ اپنی اور دوسروں کی دعا پر مولاناؒ کا اعتماد بے مثال ہی کہا جائے گا۔ اپنی تمام چھوٹی بڑی ضرورتوں کے متعلق دعا کا خصوصی اہتمام خود بھی فرماتے اور دوسروں سے بھی اس کی گزارش فرماتے۔ آخری چند سالوں سے تو یہ معمول تھا کہ موقع بہ موقع اپنی ضرورتوں کو ایک کاغذ پر تحریر کر کے اس کی نقلیں تیار کرواتے اور طلبہ اور متعلقین کو بھیجتے تھے۔ ایک رمضان میں راقم الحروف اپنے دوست مفتی اسجد صاحب زید مجدہ کے ہمراہ ڈابھیل خانقاہ میں معتکف تھا۔ حضرت مولاناؒ نماز کے لیے تشریف لاتے تو صفِ اول میں مفتی اسجد صاحب ان کے بغل میں ہوتے اور نمازوں سے قبل اور بعد؛ خاص کر جمعہ سے قبل آپؒ کی دعاؤں کو بخوبی سنتے تھے۔ بقول ان کے: مولاناؒ چھوٹی بڑی تمام ضرورتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش فرماتے تھے، اس وقت آپؒ کے ایک صاحبزادے کا نکاح باقی تھا تو اس کے لیے صورت وسیرت میں حسین اور دل ونظر کو ٹھنڈی کرنے والی بیوی؛ اور دیگر بہت سی چھوٹی موٹی ضرورتوں کی دعا کرتے ہوئے وہ مولانا کو سنتے تھے"۔

آپؒ کے درس کی جھلکیاں

درس کی پابندی

آپؒ عمر رسیدہ، پیرانہ سالی اور کافی ضعف کے باوجود بڑی پابندی سے بلاناغہ روزانہ درس گاہ میں تشریف لاتے۔ اپنی دھیمی دھیمی سی مستانہ چال کے ساتھ درس گاہ کے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سب سے پہلے بہ آوازِ بلند ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہہ کر سلام پیش فرماتے اور پھر بڑے ادب ووقار کے ساتھ مسند نشیں ہوتے۔

عطر اور خوشبو کا تذکرہ

چوں کہ آپؒ کو خوشبو کی سنت سے بہت زیادہ محبت تھی؛ اس لیے آپؒ کے درس گاہ میں تشریف لانے سے پہلے طلبہ آپؒ کے سامنے تپائی (بینچ) پر رنگ بہ رنگی عطر کی شیشیاں قطار اندر قطار رکھ دیتے، قبل از درس آپؒ اپنے مخصوص انداز میں تپائی پر رکھی ہوئی ہر ہر شیشی سے اپنے کپڑے، ٹوپی اور ڈاڑھی وغیرہ پر عطر لگا کر خوب معطر ہو جاتے، بعدۂ آپؒ کا علمی فیضان اِس طرح جاری ہوتا کہ فضا کے معطر ہونے کے ساتھ ساتھ طلبہ کے قلوب بھی علمی نور سے منور ہونے شروع ہو جاتے۔

قبل از درس مخصوص ادعیہ واذکار کا اہتمام

آپؒ درس کے باقاعدہ آغاز سے قبل بڑے پیارے اور نرالے لب

و لہجے، اور اچھوتے انداز میں اللہ کے حضور چند دعاؤں کا بڑی پابندی سے اہتمام فرماتے تھے، کہ طلبہ کو بھی اُن کے مخصوص لہجوں کے سائے میں کافی دعائیں یاد ہوجاتیں، ''گویا اچھوں کی نقالی بھی اچھا اثر دِکھاتی ہے''۔ بعض مرتبہ طلبہ کو اُن کا لب ولہجہ اپناتے ہوئے پوری پوری تقریر ہو بہو ازبر ہوجاتی، بہت سے طلبہ کو حضرت مغیث اور حضرت بریرہ -رضی اللہ عنہما- کا مشہور واقعہ ہو بہو اُن کے لب ولہجے میں نوکِ زبان ہونا؛ اس کی بیِّن شہادت ہے۔

حضرت الاستاذ اپنے خاص انداز میں پہلے یہ درود شریف پڑھتے:

''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُونَ،
وَكُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُونَ''.

پھر اِن دُعاؤں کا اہتمام کرتے:

''سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَاعَلَّمْتَنَا، إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ. رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي، وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي، يَفْقَهُوا قَوْلِي. رَبِّ يَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَيْرِ، وَبِكَ نَسْتَعِيْنُ يَافَتَّاحُ. رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا. اَللّٰهُمَّ فَقِّهْنَا فِي الدِّينِ، وَعَلِّمْنَا تَأْوِيلَ الْأَحَادِيثِ. اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَايَنْفَعُ، وَقَلْبٍ لَا يَخْشَعُ، وَنَفْسٍ لَاتَشْبَعُ، وَدُعَاءٍ لَايُسْمَعُ، وَمِنْ هٰـؤُلَاءِالْأَرْبَعِ. اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَعِيْنُكَ عَلَى الدَّرْسِ وَالتَّدْرِيسِ''.

علاوہ ازیں اور بھی کئی مسنون دعاؤں کا اہتمام فرماتے۔

اِفہام وتفہیم کا سہل اور نرالا اسلوب

آپؒ کی عبارت خوانی اور عام فہم آسان اسلوب میں اردو ترجمہ وتشریح معروف ومشہور ہے، جس میں آپ بڑی احتیاط سے کام لیتے اور بعض مقامات پر ایسا ترجمہ اور ایسی تقریر سننے کوملتی کہ طلبہ عَش عَش کر اٹھتے۔ تدریسی اعتبار سے آپ بڑے ہی لائق وفائق تھے۔ آپؒ کے یہاں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم اگر دھیان سے سبق سنتا تو مشکل سے مشکل ترین عبارت سمجھ لیا کرتا تھا۔ آپؒ کا اعجاز دراعجاز یہ تھا کہ اپنے سیکھے ہوئے سرمائے سے زیادہ اور بہت زیادہ؛ نہایت کم وقت میں بڑی سہولت کے ساتھ اپنے طلبہ کو سکھا دیتے تھے۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی -مدظلہ العالی- فرماتے ہیں کہ:

’’حضرتؒ کا درس بڑا عجیب ونرالا ہوا کرتا تھا، خصوصاً مشکل عبارتوں کے سلسلے میں، -ہم لوگ جب پڑھتے تھے اُس وقت- مشہور تھا کہ: ہدایہ رابع میں آج ’’کتاب الشفعۃ‘‘ ہے، ابھی مولانا آئیں گے اور مسئلے کو پانی پانی کردیں گے۔ اور واقعہ بھی ایسا ہی تھا کہ مشکل عبارتوں کو مکرر، سہ کرر، تعبیرات بدل بدل کر اتنی مرتبہ سمجھاتے تھے کہ طلبہ اس کو ’مسئلہ پانی پانی کردیا‘‘ سے تعبیر کرتے‘‘۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی -مدظلہ العالی- ہی فرماتے ہیں کہ:

’’جب ہم عربی چہارم میں پڑھتے تھے تو اُس وقت یوں سمجھیے کہ ’’معارف

القرآن'' آپ کو مکمل زبانی یاد تھی۔ بعد میں ''معارفُ القرآن'' دیکھو اور حضرتؒ کی تقریر دیکھو تو ''معارف القرآن کی - خلاصۂ تفسیر'' سے لے کر ''احکام ومسائل'' تک کی مکمل باتیں سبق میں آجاتی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پوری ''معارف القرآن'' آپ کو زبانی یاد ہے''۔

اِس سلسلے میں ایک واقعہ حضرت قاری محمد رضوان صاحب پالنپوری مدظلہ العالی نے تحریر فرما کر عنایت فرمایا تھا جو ہدیۂ قارئین ہے:

''مبدأ فیاض نے استاذِ مرحوم ومغفور کو بے شمار کمالات سے نوازا تھا، اُن میں سے ایک تو آپ کا غیر معمولی حافظہ تھا، کہ دورانِ درس داخلِ نصاب متون اور اُن کی شروحات کے طویل طویل اقتباسات بجنسہ نقل کرتے اور بلا تکلف بولتے چلے جاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھلی کتاب اور شرح سے دیکھ کر بول رہے ہیں۔

نیز طلبہ کی غفلتوں اور کوتاہیوں سے واقف ہونے کے باوجود وقت پر چشم پوشی کر جانا اور ان کی اصلاح کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا؛ یہ بھی آپؒ کا وصفِ خاص رہا ہے۔ ایک واقعے سے اِن دونوں اوصاف کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا:

ایک مرتبہ جامعہ میں ششماہی یا سالانہ کے موقع پر ترجمۂ کلامِ پاک کا تقریری امتحان مولانا مرحوم کے سپرد ہوا، مولاناؒ نے تقریری امتحان کے بجائے چند سوالات طلبہ کو کاپیوں میں لکھوا دیے، طلبہ نے جوابات لکھ کر کاپیاں مولاناؒ کے حوالے کر دیں اور کسی طالبِ عالم سے کچھ نہیں کہا۔ پھر ایک مدت کے بعد ان ہی

طلبہ میں سے ایک طالبِ عالم کی کسی نازیبا حرکت یا شکایت پر مولاناؒ خوب خفا ہوئے اور سخت سست کہا اور اثنائے تنبیہ مولاناؒ نے فرمایا کہ: آپ نے ترجمۂ کلامِ پاک کے جوابات ''معارف القرآن'' سے بعینہ (سرقہ) چوری کر کے لکھے تھے، ہم آپ کی علمی صلاحیت ولیاقت اور استعداد سے خوب واقف ہیں، آپ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ''معارف القرآن'' کے حافظ ہیں، آپ ہمیں یہ دھوکا دینے کی ہرگز کوشش نہ کریں کہ وہ پورا جواب آپ نے از خود لکھا ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ کیسے لکھا ہے''۔

اِفہام وتفہیم کے خداداد ملکہ کا اندازہ ذیل کے واقعے سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے: آپؒ ہی کے ایک شاگردِ رشید ادیبِ جامعہ حضرت مفتی عرفان صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ:

''جس وقت شرح وقایہ میں اور اسی طریقے سے فقہ کی دوسری کتابوں میں ''طہرِ متخلل'' کا مسئلہ آتا تھا تو یہ مسئلہ واقعتاً میرے لیے بڑا پیچیدہ تھا، سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا؛ لیکن جب طحاوی شریف میں یہ مسئلہ آیا، تو حضرت مولانا یوسف صاحبؒ نے حیض ونفاس اور طہرِ متخلل والے اِس مسئلے کو اتنی عمدہ تشریح اور اتنی عمدہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا کہ (باقاعدہ میں نے اُس کو اپنی کاپی میں لکھا بھی اور ریکارڈ بھی کیا) حضرت مولاناؒ کی برکت سے یہ مسئلہ میرے ذہن میں اتنا منقح ہوا کہ آج بھی اگر کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو -الحمد للہ- میں خود ہی حل کر لیتا ہوں۔

حضرت مولاناؒ کی برکت سے یہ مسئلہ میرے ذہن میں اس قدر مستحضر ہوگیا''۔

حضرت مفتی ابوبکر صاحب مدظلّہ العالی کا بیان ہے کہ: ''تفہیم کا انداز انتہائی نرالا تھا اور افہام وتفہیم میں اس قدر نیچے اترتے تھے کہ شاید یوں کہا جاسکتا ہے کہ افہام وتفہیم کی دنیا میں یہ آخری نقطہ ہے، اس کے بعد اب نزول کا کوئی درجہ نہیں؛ یہ بات مسلّم تھی کہ غبی سے غبی طالبِ علم، کند ذہن سے کند ذہن طالبِ علم اگر سبق دھیان سے سنے تو اس کے لیے سمجھنا یقینی ہے۔

ایک اہم خصوصیت عجیب وغریب تھی، جو صرف مولاناؒ ہی کے درس میں دیکھی، وہ یہ کہ مترادفات کا استعمال۔ جب کبھی بھی طبیعت میں نشاط ہوتا تو مولانا مترادفات کا بہ کثرت استعمال فرماتے اور ذخیرۂ الفاظ کا یہ ''بند'' جب کھل جاتا تو بند ہونے کا نام نہ لیتا۔ اس سے بلا کسی تصنّع اور بلا کسی مبالغے کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ مترادفات کے استعمال میں یدِ طولی رکھتے تھے، جو حضراتِ فنِ ادب سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اِس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ مترادفات کا استعمال کتنا مشکل امر ہے اور اس مشکل کو اگر یوں تعبیر کیا جائے ''جوئے شیر لانے کے مترادف ہے'' تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

ایک خصوصیت تو ایسی ہے کہ شاید ہی اس کا کوئی انکار کرسکے، وہ یہ کہ معقولات کو محسوسات بنانے اور مغیبات کو مشاہدات کا روپ دینے میں آپ کا کوئی جواب نہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ یہ چیز بالکل نگاہوں کے سامنے ہے، ہمارے سامنے یہ

چیز ہو رہی ہے اور پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ جب آدمی بہت باکمال ہو جائے اور ایک اونچے درجے پر پہنچ جائے تب جا کر یہ چیز حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ چیزیں ہمارے سامنے ہوتی ہیں تو ہمیں ان کی قدر نہیں ہوتی، احساس نہیں ہوتا؛ لیکن جب ہمیں کسی جگہ (یعنی مسندِ تدریس پر) بیٹھنا ہوتا ہے، تب جا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ آدمی کا کس قدر اونچا اور ماہر تھا، معقولات کو محسوسات میں ڈھالنے کا یہ عظیم ملکہ تھا جو مبدأ فیاض کی جانب سے مولاناؒ کو عطا ہوا تھا''۔

آپؒ کے ترجمہ کی عمدگی

آپؒ کے فیض یافتگان اِس بات کی یقیناً شہادت دیں گے کہ مولاناؒ حدیث کا جو ترجمہ کرتے تھے اُس کی کوئی نظیر پیش نہیں کرسکتا، اگر میں یوں کہوں کہ: آپؒ کا ترجمہ ''شیخ الہندؒ کی لطافت اور علامہ عثمانیؒ کی سَلاسَت'' کا حسین سنگم اور آئینہ دار تھا تو یقیناً بے جا نہ ہوگا۔ چنانچہ آپؒ ہی کے ایک خوشہ چیں ادیبِ جامعہ حضرت مفتی عرفان احمد صاحب مالیگانوی مدظلہ کی زبانی ملاحظہ فرمایئے!

''واقعتاً مولاناؒ کا ترجمہ اتنا عمدہ ہوتا تھا کہ جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا ہے، مشکوٰۃ شریف اور ریاض الصالحین میں بہت لہک لہک کر اور بہت جھوم جھوم کر حضرتؒ بے تکلف بیسیوں احادیث کا ترجمہ کرتے ہوئے چلے جاتے تھے اور ترجمہ اتنا زوردار اور اتنے پیارے لہجے میں ہوتا کہ جس کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا نہیں جاسکتا''۔

اکابرینِ دیو بند وسہارنپور سے والہانہ عشق

دورانِ درس اکابرین واسلاف کے واقعات بیان کرکے ان سے محبت وعشق کی ترغیب کا اتنی کثرت سے معمول تھا کہ گویا سبق کا جزوِ لاینفک بن گیا تھا۔ اکابرین کے واقعات ایسے پُرکشش اور دل رُبا انداز میں گوش گزار کرتے جس کی بنا پر طلبہ کی زندگی کا وَرق وَرق بدل جایا کرتا اور اُن کے دل کی کایا پلٹ جایا کرتی تھی۔ جب کبھی اکابرین کا تذکرہ چھڑ جاتا تو آپؒ آب دیدہ ہو جاتے اور کیف وطرب کی حالت میں چلے جایا کرتے تھے۔

آپؒ کو علمائے دیو بند وسہارنپور سے بے حد محبت اور والہانہ لگاؤ تھا، ان میں بھی بالخصوص شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور ناظم صاحب حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوریؒ سے تو جنون کی حد تک عشق تھا۔ جب ان کا ذکرِ خیر آجاتا تو طلبہ قلم بند کرکے بیٹھ جاتے کہ اب گھنٹہ بھر یہ محفل ''صالحین'' کے ذکر سے ''کشتِ زعفران'' بنی رہے گی، اور یہ مشہور تھا کہ: اب استاذ جی سہارنپور تشریف لے گئے ہیں، گھنٹے کے ختم تک واپس نہیں آئیں گے۔ طلبہ کی ہمہ تن توجہ آپؒ میں ایک روح پھونک دیتی اور پھر حضرت شیخ، حضرت ناظم صاحب اور سہارنپور کا ایسا تذکرہ فرماتے کہ نادیدہ؛ بندہ دیکھا ہوا محسوس کرے اور دیدہ؛ اپنے دیکھے ہوئے پر شرمندہ ہو کہ شیخ اور سہارنپور کا تذکرہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے!۔ ایک ایک گلی، ایک ایک کوچہ اور ایک ایک عمارت کا نام نوکِ زباں ہوتا اور جھوم جھوم

کے اپنے مخصوص انداز میں بے دھڑک اس طرح بولتے چلے جاتے کہ گویا پورا سہارنپور آپؒ کی نظروں کے سامنے ہے۔ اِسی محویت کے عالَم میں جب گھنٹی بج جاتی، تب طلبہ کو پتہ چلتا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور اکابرینِ سہارنپور کے عشق کی چنگاری ہمارے دل میں بھی فروزاں کر گئے۔

ہمارے علمائے دیوبند بھی ایسے تھے!

جب دورانِ درس نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی مخصوص عمل یا کسی صحابی کا اتباعِ سنت کے تعلق سے کوئی واقعہ آجاتا، تو اُس موقع پر بڑے دل کش انداز میں فرماتے کہ: ”ہمارے علمائے دیوبند بھی ایسے ہی تھے!!“

مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سفرِ ہجرت کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ: جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکۂ مکرمہ کو الوداع کہہ کر مدینۂ طیبہ کا رُخ کیا، تو اثنائے راہ ”غارِ ثور“ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تین دن تک قیام کیا تھا، تین روز کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اطمینان ہوگیا کہ اب مشرکین نے تھک ہار کر تعاقب کرنا چھوڑ دیا ہوگا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غار سے نکل کر مدینہ کی اور روانہ ہو گئے۔

اِس واقعے کو نقل کرنے کے بعد فرماتے کہ: ”ہمارے علمائے دیوبند بھی ایسے ہی تھے، جب انگریزوں نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا، تو آپ تین دن تک روپوش ہو گئے۔ تین دن کے بعد باہر نکل آئے۔ کسی نے کہا: حضرت! آپ باہر کیوں نکل آئے، پولیس

تو ابھی بھی آپ کو ڈھونڈ رہی ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ: میں اِس وجہ سے تھوڑی چھپا تھا کہ مجھے انگریزوں کی گرفتاری کا ڈر ہے، میں تو اس لیے چھپا تھا؛ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غارِ ثور والی سنت ادا ہو جائے''۔

اسی طرح روایتوں میں آتا ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا کہ: آپ میری ساری زندگی کی نیکیاں لے لیں اور اس کے بدلے میں غارِ ثور کی تین راتوں کی نیکیاں مجھے دے دیں۔

اس پر آپؒ فرماتے کہ: ''ہمارے علمائے دیوبند میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر رائپوریؒ نے مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ سے فرمایا کہ: تقسیمِ ہند کے موقع پر دہلی کے خوف وہراس والے ماحول میں آپ نے جو ہر طرف گشت لگا کر مسلمانوں کی خدمت کی ہے، صرف ان تین دن کی خدمت مجھے دے دیں اور اس کے بدلے میں میری پوری زندگی کی عبادت وریاضت اور نیکیاں لے لیں''۔

بلا کی ذہانت اور بے نظیر قوتِ حافظہ

خدائے وہّاب نے آپؒ کو وہ بے نظیر حافظہ دیا تھا کہ مسئلے کے اِفہام وتفہیم کے وقت بہ کثرت کتبِ فقہ کی لمبی لمبی عربی عبارتیں بے تکلف آپؒ کی زبان سے بہتے پانی کی طرح جاری ہو جاتی تھیں، بہ طورِ خاص نورالایضاح اور قدوری کی عبارتیں تو آپ اِس طرح پڑھ جاتے گویا یہ کتابیں آپؒ کے سامنے کھلی ہوئی ہیں۔

یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپؒ اتنی لمبی اور طویل تقریر فرماتے اور کہیں کچھ اشارے لکھ کر لاتے ہوں۔

آپؒ کی قوتِ حافظہ کو آپ کا ہر خوشہ چیں شاگرد سراہتا اور مانتا ہے؛ حتیٰ کہ استاذِ جامعہ ہذا مفتی عبد القیوم صاحب کڈی دامت برکاتہم کے سامنے آپؒ کا تذکرہ ہوا تو فرمانے لگے کہ: ہم نے آپ کے پاس بہت سی کتب پڑھی ہیں؛ لیکن جب آپ ہمیں ''مقاماتِ حریری'' کا درس دیتے تھے تو دورانِ تدریس ''مقامات'' کے مشکل الفاظ کی لغوی صرفی تحقیق کے ساتھ قرآن میں جہاں جہاں وہ فعل یا اسم مذکور ہوتا تو وہ آیت یا حدیث ہمیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور بہ ذاتِ خود ہم نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس سے آپ کے حافظے کے قوی ہونے اور قرآنی آیات میں گہرائی وگیرائی اور استحضار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آپؒ کی قوتِ حافظہ کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ چند سالوں پہلے سنایا ہوا قصہ جب دوبارہ اِرشاد فرماتے – گو چند سال بیت گئے ہوں – تو سابقہ تفصیلات سے سرِ مو انحراف نہ ہوتا؛ بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہہ سکتا ہوں کہ آپؒ نے پہلی مرتبہ وہ قصہ جس انداز، جس لب ولہجے، جن تعبیرات اور جن الفاظ کے ساتھ سنایا ہوتا، دوسری مرتبہ بھی بعینہٖ وہی اسلوب، وہی لب ولہجہ، وہی تعبیرات اور وہی الفاظ ہوتے، ان میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ گویا آپؒ ہر مرتبہ کتاب کھول کر سنا رہے ہیں۔

ظرافت اور خوش مزاجی

دورانِ درس آپؒ طلبہ کو ہنساتے بھی تھے، جس وقت آپ خود ہنستے تو درس گاہ میں ایسی دل کش اور خوش گوار فضا تیار ہو جاتی کہ آج بھی اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے طلبہ جب اس قابلِ رشک فضا کا تصور کرتے ہیں تو اپنے سارے غم بھول کر بڑے وَجد میں آجاتے ہیں۔

آپؒ چوں کہ طبعاً نہایت ظریف واقع ہوئے تھے، اس لیے چٹکلے سے ظرافت کے شگوفوں اور مسکراہٹ کی پھول جھڑیوں میں طلبہ کی بڑی تربیت بھی فرمادیا کرتے تھے۔ ذیل میں کچھ شگوفے ملاحظہ فرمائیے:

[الف] ایک مرتبہ اپنے حلقۂ درس میں فرمانے لگے: ''کچھ ٹوٹا پھوٹا عربی بھی آپس میں بولا کرو''۔ پھر اپنے نرالے لہجے میں فرمانے لگے کہ: ''جب تم حج کے لیے جاؤ گے تو وہاں کی دُکانوں پر کوئی گجراتی اور اردو لیبل لگا ہوا نہیں ملے گا، وہاں سب عربی میں لکھا ہوا ہوتا ہے''۔

آپ کی قوتِ حافظہ کا اندازہ لگائیے، کہ یہ کہنے کے بعد آپ اُن عربی لکھے ہوئے لیبل طلبہ کو عربی لب ولہجہ میں بتلانے لگے، جیسے: ''اَلثِّيَاب الْمُجَهَّزَة مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ'' یعنی: ''جینس اور لیڈس کے ریڈی میڈ کپڑوں کی دُکان''۔ اِس طرح اور بھی بہت سارے نام شمار کرائے اور آگے ظرافت آمیز لہجے میں فرمانے لگے: ''وہاں ایک مرتبہ چلتے چلتے ایک کھڈّا (گڑھا) آیا، تو میرے

ایک ساتھی نے کہا: ''الْکَھادھرَا الکھادھرَا'' اس کے بعد آپؒ بہ آوازِ بلند ہنس پڑے جس کی ادا آج بھی بھلائی نہیں جاسکتی۔

[ب] اسی طرح عربی پنجم کے سال میں ''آثار السنن'' کے سبق کے وقت اٹھارہویں پارے کی آیت: ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ تلاوت کرنے کے بعد ﴿غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ﴾ کا معنیٰ طلبہ سے دریافت کیا، اس کے بعد ہنستے ہنستے بعض طلبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہ اندازِ ظرافت فرمانے لگے: ''دیکھئے! یہ ''نادی'' چلاتے ہیں''۔ گویا آپ اِس طرح ظرافت کے انداز میں طلبہ کو اُن کا مقام یاد دِلاتے کہ: کم از کم اس مقام پر پہنچ کر تو کچھ نہ کچھ ٹوٹی پھوٹی عربی بولنا اور سمجھنا آہی جانا چاہیے۔

[ج] اسی طرح ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ: طلبہ کی بھی عجیب دنیا ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ چند طلبہ رات کے وقت دیر سے مدرسے میں پہنچے تو دربان نے ان کی گرفت کی اور نام دریافت کیے- دربان ایک ناواقف دیہاتی تھا- تو ایک طالب علم نے بتایا ''بخاری''، دوسرے نے ''مسلم'' اسی طرح ہر ایک نے اپنا نامِ گرامی بتلایا، تو دوسرے دن صبح دربان نے پرچی لکھ کر دفترِ اہتمام میں پہنچادی۔ مہتمم صاحب اسے دیکھ دیکھ کر بڑی دیر تک ہنستے اور مسکراتے رہے۔ اس طرح طلبہ کے ساتھ بڑی ظرافت اور خوش مزاجی وخندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ آپ کا اندازِ درس ہر لحاظ سے ایسا تھا جس میں کہیں سے کہیں

تک انگلی اٹھانے کی گنجائش نہ تھی، درس کے اس نرالے اسلوب پر مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلوب آپؒ کی عظمت و تعظیم سے لبریز ہو جاتے۔ یہ ایک بہت بڑا ملکہ اور کمال ہے، جس کی بنا پر استاذ اور شاگرد کے درمیان علمی فیضان برابر جاری وساری رہتا ہے؛ ورنہ ایک ذرا سی اکتاہٹ بھی شاگرد کو استاذ کے علم کی روشنی سے محروم کر دیتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

شب و روز کی محنت سے تجھے کیا ہو حاصل
جب کہ تیرا دل خالی ہو استاذوں کی عظمت سے

طلبہ پر شفقت و مہربانی

مشفق و مہربان ایسے تھے کہ دورانِ درس کسی طالبِ علم کی غلطی پر گوش مالی تو کیا کرتے؛ بلکہ کسی اور استاذ کو گوش مالی کرتے دیکھ لیتے تو اُن کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ چنانچہ آپ خود ایک طالبِ علم کا واقعہ سناتے ہیں کہ:

''میں ایک مرتبہ معمول کے مطابق درس گاہ کی طرف آ رہا تھا، ایک صاحب کسی طالبِ علم کو مرغا بنا کر پٹائی کر رہے تھے۔ میں نے اتفاقاً یہ منظر دیکھ لیا، جب بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی ہیں''۔ جب جب یہ واقعہ سناتے تو بار بار یہ بات ارشاد فرماتے کہ: بے چارے اُس طالبِ علم کو کیوں مار رہے ہوں گے؟! اس وقت آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور شفقت و مہربانی کے وہ قیمتی جو ہر و گوہر بکھیرتے کہ خود طلبہ کی آنکھیں بھی بھیگ

جاتیں، فرماتے: ''اگر عہدہ اور کوئی منصب ہاتھ آجائے تو کسی پر بلا وجہ سختی نہیں کرنی چاہیے، سختی سے تنفیر پیدا ہوتی ہے، دل اُچٹ جاتا ہے، طالبِ علم کو بغیر مارے شفقت ومہربانی اور لاڈو پیار سے تعلیم وتربیت دینی چاہیے، بلا وجہ جو ظلم کرے گا وہ اس کا بدلہ دنیا ہی میں دیکھ لے گا''۔ استاذ فرماتے ہیں کہ: ''ہم نے ایسے آدمیوں کو دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں''۔

حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ:

''مجھ ناچیز کے اوپر بھی حضرت کی بہت شفقتیں تھیں اور بہت سی تو ایسی کہ میں اگر سناؤں تو اپنی شیخی بگھارنے کے درجے میں ہو جائے گا............ جس طالبِ علم کے بارے میں اُن کے دل میں یہ بات اُتر جاتی کہ یہ محنتی طالبِ علم ہے تو ایسی شفقتیں کر گذرتے تھے کہ طالبِ علم پانی پانی ہو جاتا تھا۔

عربی سوم میں ''شرح ابن عقیل'' کی عبارت خوانی اور اس کا ترجمہ مجھ سے ہی متعلق تھا، روزانہ مجھے عبارت پڑھنی ہوتی تھی اور ترجمہ بھی مجھے ہی کرنا ہوتا تھا۔ کنز الدقائق بھی بہت شفقت کے ساتھ پڑھاتے۔ ایک دن میرے بہت قریبی دوست کی شادی تھی، ہر چند مَیں نے معذرت کی؛ لیکن چوں کہ اتنا قریبی دوست تھا کہ مَیں ہار گیا، تو اُس دن مَیں مدرسہ نہیں آسکا۔ مولانا یوسف صاحبؒ نے — حالاں کہ اُنھیں پتہ تھا کہ میں مہتمم صاحب ہی کے ساتھ رہتا ہوں، ماموں ہیں، اُنھیں ضرور پتہ ہوگا کہ یہ شادی میں گیا ہے — ہمارے ایک خالہ زاد بھائی کو رُقعہ

دے کر یہ کہلوا بھیجا کہ جاؤ! مہتمم صاحب سے یہ کہہ کر آؤ کہ یہ ہمارے ’’کنز‘‘ کا سبق چھوڑ کر شادی میں گیا ہے۔

عصر کے بعد مولاناؒ کی مجلس لگتی تھی، طلبہ خدمت میں حاضر ہوکر استفادہ کیا کرتے تھے، اُن طلبہ کے بیچ فرمایا کہ: ’’اِن سے ہمارا جو حُسنِ ظن تھا سب ختم ہوگیا‘‘۔ اور دوسرے دن تو قیامت برس گئی، مولانا تشریف لائے، بالکل اُوپر نہیں دیکھ رہے ہیں، بس نیچے ہی دیکھ کر سبق پڑھائے جارہے ہیں اور ایک دن، دو دن، تین دن، چار دن؛ کئی روز گذر گئے، مولاناؒ جیسے آکر نظر جھکاتے، ختمِ سبق کے اوپر نظر اُٹھاتے تھے۔

ایک دن خالہ جان (مولانا کی اہلیہ) ہمارے گھر تشریف لائی ہوئی تھیں، اُس وقت گھر والوں نے بات صاف کی کہ: یہ تو نہیں جانا چاہتا تھا؛ لیکن اِتنا اِصرار تھا کہ مجبوراً لے جانا پڑا۔ تب جاکر مولاناؒ کی شفقتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور میں نہیں بتاسکتا ہوں کہ مولاناؒ کی کس قدر شفقتیں تھیں‘‘۔

راقم عرض کرتا ہے کہ: حضرت الاستاذؒ نے بہ ذاتِ خود یہی واقعہ ہمیں تقریباً دو یا تین مرتبہ سنایا، اور سنانے کے بعد یہ اِرشاد فرمایا کہ: ’’اُس دن میں نے ’’کنز‘‘ کا سبق بھی نہیں پڑھایا تھا‘‘۔

اِس سال بھی آپؒ نے ایک موقع سے یہ واقعہ سنایا اور یہی جملہ اِرشاد فرمایا کہ: ’’اُس دن میں نے سبق بھی نہیں پڑھایا‘‘۔ اتفاق سے ایسا ہوا کہ

دوسرے ہی دن وقفے کے بعد کسی عذر کی وجہ سے مجھ (راقم الحروف) کو پہنچنے میں تاخیر ہوگئی، استاذِ مرحومؒ نے ساتھیوں سے میرے متعلق دریافت کیا، تو اُنھوں نے بتایا کہ: وہ تو حاضر ہے، شاید کسی وجہ سے تاخیر ہورہی ہے۔ یہ سن کر آپؒ نے سبق شروع نہیں کیا۔ پھر جب بندہ حاضر ہوگیا تو اس کے بعد آپؒ نے سبق شروع فرمایا۔ ان سطور کو رقم کرتے وقت جب یہ بے پایاں شفقتیں یاد آجاتی ہیں تو بے اختیار بلک بلک کر رونے کو جی چاہتا ہے۔

آپؒ کی طلبہ کے ساتھ شفقت ومہربانی کا اندازہ ذیل کے قصے سے بھی لگایا جاسکتا ہے، حضرت قاری رضوان صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ:

''حضرت کی وفات کے بعد بدھ کے دن پہلے گھنٹے میں مولوی محمد علی بمبوی (جو اِسی جامعہ ہذا کے فاضل ہیں اور حضرتؒ کے خادمِ خاص رہے ہیں، اُنھوں) نے سنایا کہ: ایک موقع پر میں بیمار ہوگیا، تو حضرت ضعف ونقاہت، پیرانہ سالی اور معذوریوں کے باوجود عشا کی نماز کے بعد ''گارڈی ہسپتال'' میں میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے حضرتؒ کو دیکھا تو اپنی بیماری بھول گیا اور کہنے لگا: حضرت! آپ نے اتنی کمزوری کے باوجود تشریف لانے کی زحمت کیوں اٹھائی؟ کسی کو بھیج دیتے، آپ کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے لیے دعا فرمادیتے۔ فرمایا کہ: نہیں! یہ میرا حق ہے، میری طبیعت میں بے چینی تھی، آپؒ کو دیکھا تو مجھے راحت ملی''۔

بات دراصل یہ تھی کہ آپؒ اپنے خادموں کو ہمیشہ اپنا محسن سمجھتے تھے۔

امتحان کے موقع پر دعاؤں کے رُقعے

طلبہ پر شفقت ہی کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی امتحان کا زمانہ آتا تو آپؒ امتحان کی آسانی کے لیے بہت پہلے ہی مختلف دعاؤں کی چِٹھی لکھ کر دیوار اور نوٹس بورڈ وغیرہ پر آویزاں کروادیا کرتے تھے اور اس میں یہ ہدایت لکھ دیتے تھے کہ: اِس دعا کا وظیفہ پڑھو، ان شاء اللہ آپ لوگوں کے لیے امتحان آسان ہو جائے گا۔

یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کے دل میں مہمانانِ رسول کے تئیں محبت وعظمت، شفقت وعطوفت اور اُن کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھنے کا جذبہ موجزن ہو۔

دورانِ تدریس زبانِ درّبار سے نکلے ہوئے قیمتی موتی

آپؒ دورانِ درس طلبہ کو زندگی کے ہر نشیب وفراز اور دور ودراز راہوں میں آنے والی کٹھنائیوں اور مشکلات سے نکلنے کے رہنما اصول اور لائحۂ عمل بھی بتلاتے تھے۔ نیز اپنے قیمتی جواہر پاروں سے طلبہ کی اصلاح وتربیت بھی فرمادیا کرتے تھے۔ خوش نصیب ہے وہ طالب علم جس نے مولانا کے قیمتی موتیوں کو اپنے دامنِ صدف میں جگہ دی اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اُن کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور بنانے کی کوشش کی۔

یقیناً بہت سے طلبہ نے آپؒ کی سینکڑوں قیمتی نصیحتوں کو اپنی جیبی ڈائری یا دریچۂ دل میں جگہ دے کر باہتمام خاص محفوظ کیا ہوگا۔ تاہم میں انتہائی شکرگزار

ہوں اپنے اُس رفیقِ درس (انس بن عبداللہ پگوٹھی) کا جس نے -فرضِ کفایہ کے طور پر- آپؒ کے صدف سے نکلے ہوئے بہت سے قیمتی و نایاب موتی -اپنے معمول کے مطابق- اپنی جیبی ڈائری میں محفوظ کررکھے تھے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے رفیقِ درس کی یادداشت سے کچھ نصیحتیں قارئین کی خدمت میں پیش کردوں، اِس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(۱) ہمارے ہاتھ گندے ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں حدیث کی یہ کتابیں عطا فرمائیں، دعا کریں کہ اللہ ہمیں تادمِ حیات حدیث کا شغل عطا فرمائے، کہیں ہماری بدعملی اور سنت کی خلاف ورزی سے ہمیں محروم نہ فرمادے؛ اس لیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ دینا جانتے ہیں، لینا بھی جانتے ہیں۔

(۲) اللہ کے خزانے بے شمار ہیں، کوئی لینے والا چاہیے۔

پھر بڑے وجد میں آکر یہ شعر پڑھتے:

موسیٰ سے پوچھیے خدا کے دین کا حال
آگ لینے کو جائے اور پیمبری مل جائے

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام مخلوق تک پہنچاؤ اور دین کے کام میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

(۴) انسان مخلوق کی ایذا پر صبر کرنے سے اَبدال بنتا ہے؛ اس لیے اپنے اندر تحمل کا جذبہ پیدا کرو اور اللہ کی خاطر معاف کردو، بدلہ نہ لو، دنیا کیا ہے؟ آخرت

اصل ہے اور پھر یہ آیت پڑھتے: ﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ﴿٤٣﴾ ﴾ [ترجمہ: اور یہ حقیقت ہے کہ جو کوئی صبر سے کام لے اور درگذر کرجائے، تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔(توضیح القرآن، الشوریٰ: ۴۳)]

(۵) تم کسی مکتب یا مدرسے میں دین کی خدمت انجام دے رہے ہو، اور تمھارے ساتھ بے انصافی کا معاملہ کیا جائے یعنی تنزلی پر رکھا جائے، ترقی نہ دی جائے، تو اَربابِ اہتمام وانتظام سے نہ جھگڑو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ نصیحت ہمیشہ یاد رکھو: ”عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدِي أَثَرَةً وَأُمُورًا تُنْكِرُونَهَا. قَالُوا: فَمَا تَأْمُرُنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ: أَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ، وَسَلُوا اللّٰهَ حَقَّكُمْ.“ [متفق علیہ]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میرے بعد اپنے ساتھ ترجیحی سلوک اور بہت سی ایسی چیزیں دیکھو گے جنھیں تم برا سمجھو گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے موقع پر آپ ہمیں کیا ہدایت دیتے ہیں؟ (کہ اُس وقت ہمارا رویہ کیا ہو؟) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اُن (حاکموں) کا حق ادا کرنا اور اپنا حق اللہ تعالیٰ سے مانگنا۔

(۷) گناہ کرنا اور علم حاصل کرنا؛ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ گناہ حافظے کے کم زور کرنے کا بہت بڑا سبب ہے اور ترکِ معاصی کو حافظے کے قوی ہونے میں بہت بڑا دخل ہے؛ اس لیے کہ علم ایک نور ہے اور اس

نور کو معصیت سے نہیں بجھانا چاہیے۔

(۸) ہم احادیث اس لیے پڑھتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتیں سامنے آئیں اور ہم اُن پر عمل کریں۔

(۹) آدمی فتنے کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں سے زیادہ اختلاط رکھتا ہے۔

(۱۰) آزاد ذہنیت نہیں ہونی چاہیے، یہ شیطان کا کام ہے، اس سے آدمی گم راہ ہو جاتا ہے؛ اس لیے کسی پیر ومرشد سے بیعت ہو کر ان کے تابع ہو جانا چاہیے اور ہر معاملے میں اُن سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

(۱۱) جو چیز جہاں نہ ہو وہ چیز وہاں لے کر جاؤ، تو تمھاری قدر ہوگی۔ اللہ کے یہاں تواضع لے کر جاؤ؛ کیوں کہ وہاں کبریائی ہی کبریائی ہے۔

(۱۲) شرم وحیا کی یہ دولت آدمی برائیوں اور گناہوں سے بچتا ہے۔

(۱۳) نیک عمل میں ہمیشگی اور پابندی؛ یہ اللہ کو بہت پسند ہے؛ اس لیے کسی نیک عمل کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ مت دو۔ مثلاً تہجد شروع کی تو دو رکعت تو دو ہی سہی؛ لیکن دل جمعی اور استقامت کے ساتھ ادا کرتے رہا کرو۔

پابندی بہت اچھی چیز ہے، کوئی عذر ہو تو کم از کم تھوڑا بھی کر لیا کرو۔ دیکھو! ایک مرتبہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے گھر تشریف لے گئے۔ جس وقت شیخ الہندؒ پہنچے ہیں وہ حضرت

حکیم الامتؒ کی تصنیف وتالیف کا وقت تھا، تو حکیم الامتؒ نے اپنے اُستاذ سے بہ صد لجاجت عرض کیا کہ: ''حضرت! یہ میری تصنیف کا وقت ہے، اجازت عنایت ہو تو ذرا ہو آؤں، پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں''۔ یہ ہے استقامت!

(۱۴) مسبوق بننے کا شرف حاصل نہ کیا کرو، تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام کرو۔

(۱۵) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا مندی کو دیکھو، چاہے والدین اور بھائی بہن ناراض ہوں، خاص کر شادی کے موقع پر اِس کا خیال رکھو۔

(۱۶) حبِّ نبوی اور اتباعِ سنت کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔ سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کی دل شکنی اور دل آزاری نہیں کرتے تھے۔

(۱۷) ایمان میں کمال اُن اخلاق واوصاف سے آتا ہے جو اسلام میں بتائے گئے ہیں۔

(۱۸) دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو نرمی سے کام لینا چاہیے، کامیابی کا یہی گُر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اِرشاد ہے: ''إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ، وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ'' تمھیں آسانی کا معاملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے؛ دشواری کا نہیں۔

(۱۹) دعا کی قبولیت میں سب سے بڑا دخل حلال کھانے کو ہے۔ پہلے زمانے میں جب کوئی بادشاہ کرسی پر بیٹھتا تھا اور وہ ظالم ہوتا تھا تو اُس زمانے کے بزرگوں کو پتہ چل جاتا تھا اور وہ دعا کر دیتے تھے جس کے نتیجے میں اُس کو تختِ شاہی سے نیچے اُترنا پڑتا تھا۔ جب حجاج بن یوسف تخت نشین ہوا تو اُس نے سوچا

کہ اِن بزرگوں کی دعا کی وجہ سے ہم کو تخت سے اُترنا پڑتا ہے، تو اُس نے اُن بزرگوں کی دعوت کرائی اور حرام کھانا کھلایا اور پھر وہ تخت پر بیٹھ کر کہنے لگا کہ: اب مجھے کوئی اِس تخت سے نہیں اُتار سکتا؛ کیوں کہ میں نے اُن مستجاب الدعوات حضرات کے پیٹ میں حرام لقمہ پہنچا دیا ہے، اب اُن کی دعا قبول نہیں ہوگی۔

(۲۰) محبت ہمارے قبضے میں نہیں؛ بلکہ دل کے قبضے میں ہے اور دل اللہ کے قبضے میں ہے۔ دعا کیا کرو: ''يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ! ثَبِّتْ قُلُوبَنَا عَلىٰ دِينِكَ'' اے دلوں کی دنیا پلٹنے والے! ہمارے دل کو اپنے دینِ اسلام پر جمائے رکھ۔

(۲۱) ہمیشہ نظر اللہ پر ہونی چاہیے نہ کہ اسباب پر، جیسے غزوۂ بدر؛ ورنہ کامیابی حاصل نہیں ہوگی، جیسے غزوۂ حنین۔

(۲۲) انسان کو دنیا کے معاملے میں ہوشیار رہنا چاہیے، بہت بھولا پن اختیار نہیں کرنے کا۔

(۲۳) چیزوں میں کوئی تاثیر نہیں، جب تک اللہ اُس میں تاثیر پیدا نہ کرے تاثیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ بہت سے صوفیا کے نزدیک ''اِس کی وجہ سے ایسا ہوا'' کہنا یہ شرکِ خفی ہے۔

(۲۴)

بہت آسان ہے انسان چھوڑ دے سب مال و زر اپنا
بہت آسان ہے انسان چھوڑ دے تختِ سلیمانی

یہ سب آسان سے آسان تر ہے جانِ من
لیکن بہت مشکل ہے اپنے ہاتھ سے بیٹے کی قربانی

(۲۵) اللہ والوں کی غیبت کرنا سمِ قاتل ہے۔

(۲۶) دنیا دارالاسباب ہے، سبب اختیار کرو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آسمان سے اُترنے کے لیے سبب کا سہارا لیں گے۔

(۲۷) تقدیر پر بھروسہ رکھو، نہ کہ تدبیر پر، ہوگا وہی جو تقدیر میں ہوگا۔

(۲۸) شیطان کو اِس بات میں مزہ نہیں آتا کہ کوئی مسلمان نماز و دیگر عبادات وغیرہ نہ کرے؛ بلکہ شیطان کو اِس بات میں مزہ آتا ہے کہ دو مسلمان آپس میں جھگڑا کرے۔

(۲۹) اللہ کی طرف سے متقی آدمی کو رُعب حاصل ہوتا ہے، تقویٰ کی انتہا ''شبہات سے بچنا'' ہے۔ ٹرین میں اجنبی عورت کے پڑوس میں سیٹ خالی ہو اس کے باوجود آپ کا اُس عورت کے پڑوس میں نہ بیٹھنا؛ یہ تقویٰ ہے۔

(۳۰) اگر مشتبہ چیزوں میں پڑے تو گناہوں میں پڑو گے۔

(۳۱) ہمارے اکابر اپنے ذاتی کام کے لیے درس گاہ میں گدے سے نیچے اُتر جاتے تھے۔ اپنی ذاتی بات لکھنے کے لیے اپنا ذاتی دوات وقلم استعمال کرتے تھے۔ مدرسے کا مال وقف ہے، اُس کا مالک صرف اللہ ہے، مہتمم صاحب تو صرف حفاظت کرنے والے ہیں۔ حضرت مولانا یحییٰ صاحب کاندھلویؒ کا جما

ہوا سالن مدرسے کے حمام کی تپش سے قدرے گرم ہو جاتا تھا پھر بھی اُس کا پیسہ ادا کر دیتے تھے۔ یہ ہے تقویٰ!

(۳۲) تقویٰ کا اثر جانوروں پر بھی پڑتا ہے۔ دیکھو! حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مبارک زمانہ۔

(۳۳) اساتذہ کی سزا کے وقت یہ استحضار کر لیا کرو کہ: یہ تو بہت قلیل سزا ہے، صحابہؓ اور ہمارے بڑوں نے تو صرف حصولِ حدیث اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر اِس سے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کی ہیں؛ لہٰذا جس طرح اے اللہ! تو اُن سے راضی ہو گیا، ہم سے بھی راضی ہو جا۔

(۳۴) ہمارے اور صحابہؓ کے درمیان یہی فرق ہے کہ ہم گناہ کو گناہ نہیں سمجھتے اور صحابہؓ سے ذرا بھی چُوک ہوتی تو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت (عدالت) میں حاضر ہو کر جب تک فیصلہ نہ کرا لیتے تھے، تب تک اُنھیں چین نہیں آتا تھا۔

(۳۵) کتاب پڑھنے سے عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

(۳۶) اپنے اندر حلم و بردباری کی صفت پیدا کرو۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو جب اُن کی موافق پارٹی بیان کے لیے بلاتی تو مخالف لوگ اُن کو طرح طرح سے ستایا کرتے تھے، ٹوپی پھینک دیتے تھے وغیرہ وغیرہ؛ لیکن آپؒ کچھ نہیں کہتے تھے، معاف کر دیتے تھے۔

(۳۷) قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے سیرت و تاریخ کا مطالعہ کرنا بہت

ضروری ہے۔

(۳۸) بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ: ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ تہجد، تسبیح اور اتباعِ رسول کی بنا پر ملا ہے۔

(۳۹) آج ہمارا کام اس لیے نہیں بنتا کہ ہماری نماز ہی صحابہؓ جیسی نہیں ہے، قرآن میں بتلایا کہ: ﴿اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ [صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو] آج ہمارا حال یہ ہے کہ ذرا بھی کام ہو تو فلاں دفتر میں، فلاں کچہری میں پہلے چلے جاتے ہیں، ہمیں پہلے اللہ کی مدد ملنے کے اسباب اختیار کرنے چاہیے۔

(۴۰) اساتذہ اور والدین کا جتنا ادب واحترام کروگے اتنا زیادہ علم آئے گا اور علم کا مقتضیٰ عمل ہے۔

(۴۱) طالب علم چوری نہیں کرتا ہے؛ بلکہ چور طالبِ علم کی شکل میں مدرسہ میں رہتا ہے۔

(۴۲) ہم قوم کے لیے نمونۂ عمل ہیں، ہم جیسا کریں گے لوگ بھی ویسا ہی کریں گے؛ اس لیے طالبِ علم کو اچھے اخلاق اور اپنے پڑھے ہوئے علم کے مطابق عمل کرتے رہنا چاہیے۔

حلم وبردباری کا پیکر

آپؒ طلبہ کے ساتھ انتہائی محبت وحلم اور نرمی وعطوفت کا برتاؤ کرتے

تھے، طلبہ کی غفلت و بے توجہی اور خوابیدگی و مدہوشی کے صحیفے پر عفو و درگذر کا قلم پھیرنا؛ آپؒ کا معمول بن چکا تھا، زجر و توبیخ اور دھمکی و تہدید کا لفظ تو آپؒ کی زبان پر تھا ہی نہیں۔ اگر کوئی بدقماش طالبِ علم آپؒ کے پیمانۂ صبر کو چھلکا دیتا تو اُس کو بجائے ''آپ'' کے ''تو'' سے مخاطَب کرتے، جس کی وجہ سے وہ طلبہ کی چشمک زنی اور ملامت گری کا شکار تو بنتا؛ لیکن آپؒ کے چہرے پر نہ خفگی اور ناراضگی کے پھپھولے پھوٹتے اور نہ آنکھوں میں طیش و غضب کے آتشیں بَم۔

یہ تو سکّے کا ایک رُخ تھا، اب ذرا سکّے کا دوسرا رُخ بھی دیکھتے جایئے! حضرت مفتی ابوبکر صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: ''اگر کسی نے بے موقع اور بے محل کوئی بات کردی، تو اُس پر بعض اوقات بے انتہا خفا ہوتے اور شدید ناراضگی کا اظہار فرماتے، اپنی زندگی میں درجۂ عربی دوم میں مَیں نے ایک مرتبہ آپؒ کا غصہ دیکھا، جس انداز سے اور جتنے سخت لہجے میں طلبہ کو ڈانٹا، اُس کی تاب لانا مشکل ہے۔

نورالایضاح میں ''کتاب الحیض'' شروع ہوا۔ حیض کی تعریف شروع کی اور تعریف میں چوں کہ جنس، فصل وغیرہ آتی ہے تو اُس کو سمجھانا پڑتا ہے۔ اب طلبہ کے لیے چوں کہ یہ ساری چیزیں نئی ہوتی ہیں؛ اس لیے طلبہ ہنس دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اتنی گہرائی میں کیوں کر جایا جا رہا ہے۔ تو بعض طلبہ ہنس پڑے، اِس موقع پر سخت ناراض اور بے انتہا غصہ ہو کر فرمایا کہ ''آئندہ اِس طرح کی چیز میں اگر ہنسنا پایا گیا تو میں سخت سے سخت تنبیہ کروں گا''۔

طلبہ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی

حضرت الاستاذؒ جہاں ایک طرف طلبہ کے لیے ایک شفیق و مہربان شخص تھے، وہیں دوسری طرف آپؒ کے اندر یہ وصف بھی بڑا نمایاں تھا کہ آپؒ ہمیشہ اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی اور اُن کی رہنمائی بھی فرماتے رہتے تھے۔ ذیل کے واقعے سے اِس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

جس وقت حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کو ''بخاری شریف'' (جلدِ ثانی) سپرد کی گئی، اُس وقت آپؒ مسلم شریف پڑھایا کرتے تھے، اپنے استاذ سے بڑی کتاب زیرِ تدریس آنے پر حضرت مفتی صاحب کے دل میں یہ خوف اور گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ یہ تو استاذ کی گستاخی ہوگی کہ میں اُن کی موجودگی میں ''بخاری شریف'' کا درس دوں! کہیں فیض کا سلسلہ بند نہ ہو جائے اور میں علم سے محروم نہ کر دیا جاؤں۔ اس وقت مولاناؒ علیل تھے؛ اس لیے انھوں نے ہسپتال پہنچ کر آپؒ کے سامنے ساری تفصیل بیان کر دی، تو آپؒ نے خوشی و مسرت، حوصلہ افزائی اور دعاؤں کی سوغات کی ایسی بارش برسا دی کہ آتشِ خوف کے شعلے سرد پڑ گئے اور حوصلہ و ہمت کا گلشن کھل اٹھا۔

حضرت مفتی صاحب ہی کی زبانی سنیے: ''جب یہاں (جامعہ میں) بخاری شریف میرے ذمے میں ڈالی گئی، مجھے تو تصور بھی نہیں تھا، بہت تشویش ہوئی اور میں نے سوچا کہ میرے اساتذہ میں مولانا یوسف صاحب بھی موجود ہیں،

اگر ان کے دل میں کوئی بات آئی تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں فیض منقطع نہ ہو جائے۔ میں نے مولاناؒ کو تلاش کیا، معلوم ہوا کہ مولاناؒ ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں، تو میں وہاں گیا، اس وقت مولاناؒ کے سرہانے ''مسلم شریف'' رکھی ہوئی تھی، میں گیا اور سلام کیا اور عرض کیا کہ: حضرت! آپ کی موجودگی میں میرے نام ''بخاری شریف'' لکھ دی ہے، یہ تو اچھا نہیں ہوا کہ آپ کی موجودگی میں مجھے دی گئی ہے۔ اس پر مولاناؒ نے فرمایا: اس میں کیا ہو گیا؟ پڑھاؤ، خوب پڑھاؤ، خوب مطالعہ کرو۔ ایسی حوصلہ افزائی فرمانے لگے اور ایسی دعائیں دینے لگے کہ بس میں سمجھتا ہوں کہ اُن ہی کا ظرف اتنا وسیع تھا کہ (وہ اپنے سامنے) اپنے شاگردوں کی ترقی دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ان کے لیے دعائیں کرتے تھے''۔

اس کے ساتھ ساتھ آپؒ درس وتدریس کے سلسلے میں اپنے پرانے شاگردوں کی موقع بہ موقع رہبری ورہنمائی بھی فرماتے تھے۔ ایک سال آپؒ کی طبیعت کے ساتھ صحت وتندرستی نے بہت آنکھ مچولی کھیلی، جس کی وجہ سے مجبوراً کچھ دنوں کے لیے آپؒ کو سلسلۂ تدریس موقوف کرنا پڑا، جس کی بنا پر انتظامیہ نے آپؒ کی زیرِ تدریس کتاب ''شرح ابن عقیل'' کی ذمہ داری حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کے کندھوں پر ڈال دی، تو حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم آپؒ کے دولت کدے پر تشریف لے گئے اور ''شرح ابن عقیل'' کی افہام وتفہیم کے حوالے سے کچھ رہنما اصول طلب کیے، تو آپؒ نے اُن کے سامنے طرقِ

تدریس کے جام کے جام لنڈھا دیے اور رہنما اصول کا ایسا دِیا ہاتھوں میں تھما دیا جس کی روشنی میں اُنھوں نے اِس خار دار وادی کو بہ آسانی عبور کیا۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ''میں نے جب اِس سلسلے میں درخواست کی تو مولاناؒ نے فرمایا: ''شرح ابن عقیل'' کی تقریباً دس شرحیں میرے پاس ہیں، چھ شرحیں لے جاؤ، اس سے تمھارا کام چل جائے گا۔ میں نے عرض کیا: حضرت! بہت ڈر لگ رہا ہے، نیا فن ہے اور اس میں اشعار کا حَل کرنا؛ یہ بہت مشکل کام ہے۔ اس پر مولاناؒ نے میری اتنی حوصلہ افزائی فرمائی اور اتنی دعاؤں سے نوازا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی حوصلہ افزائی اور اُن کی دعاؤں کی برکت سے ہی میں پڑھا سکا''۔

مہمانانِ رسول کی عظمت

آپؒ کے دل میں مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اِس درجہ تھی کہ آپؒ نے کبھی بھی کسی طالبِ علم سے ''تو'' کہہ کر خطاب نہیں فرمایا، ہمیشہ احترام کے ساتھ ''آپ'' کے لفظ سے یاد فرماتے تھے۔ اِسی طرح جب کوئی تحریر طلبہ کے نام لکھتے تو کبھی صرف ''طلبہ'' نہیں لکھتے؛ بلکہ ''طلبۂ کرام یا طلبۂ عزیز'' لکھتے تھے۔ جب کبھی کسی سے دعا کی درخواست کرتے (آگے مفصل آرہا ہے ان شاء اللہ) تو ایسے انداز سے خطاب کرتے جیسے کوئی چھوٹا اپنے بڑے کے نام لکھ رہا ہے، جب طالبِ علم آپؒ کی دعا کی درخواست والی پرچی ملاحظہ کرتا تو وہ دیکھ کر پانی پانی

ہوجاتا کہ میرے اُستاذ مجھ سے اِس طرح خطاب کررہے ہیں!۔

قناعت پسندی ودنیا بیزاری

اِس دل فریب دنیائے رنگ وبو سے پہلوتہی وکنارہ کشی اختیار کرکے گوشۂ خمول میں پناہ لینا اور چند پھوٹی کوڑیوں پر قناعت کرکے اپنی ساری زندگی خدمتِ خلق اور نصرتِ دین کے لیے وقف کردینا؛ ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں؛ لیکن آپؒ نے توفیقِ یزداں اور عزمِ جواں کی بدولت اِس مشکل کام کو اِس طرح کر دِکھایا کہ آنے والے آپؒ کے اُسوہ اور نمونے پر چل کر کامیاب ہوتے رہیں گے۔

آپؒ کے صاحب زادے مفتی خلیل صاحب -دامت برکاتہم- نے بتایا کہ: والدصاحبؒ چوں کہ دادا کے ساتھ ''گھوڑا محلہ'' میں رہتے تھے، جامعہ میں تقرر ہونے کے بعد بھی آپؒ کئی سال تک وہیں مقیم رہے۔ جس مکان میں ہم رہتے تھے -مجھے ابھی تک یاد ہے کہ- وہ انتہائی خستہ حال مکان تھا، بارش کے دنوں میں چھپّر سے پانی چُوتا تھا۔ مدرسہ کی چھٹی ہونے کے بعد والد صاحب بہ ذاتِ خود- ہم بھی ساتھ میں شامل ہوتے تھے- کھیتوں سے کیلے کے درخت کی جڑیں اور مٹی ڈھوڈھو کر گھر کی مرمت کرتے تھے۔ جب پانی ٹپکتا تھا تو اماں کے لیے بڑی پریشانی کا باعث بن جاتا، پلنگ اور گھر کے دیگر سامان کو کبھی اِدھر سے اُدھر اور کبھی اُدھر سے اِدھر کرتے رہنا پڑتا تھا؛ لیکن والد صاحبؒ نے زندگی میں ایک مرتبہ بھی مدرسہ کی انتظامیہ کے متعلق کوئی حرفِ شکایت اپنی زبان سے نہیں نکالا''۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ: پھر کچھ سالوں کے بعد جب جامعہ کے احاطے سے باہر ایک نئی عمارت تعمیر ہوئی تو والد صاحبؒ ہم سب کو لے کر منتقل ہو گئے۔ چنانچہ اِس بلڈنگ میں سب سے پہلے ہم لوگوں ہی نے رہنا شروع کیا۔ ایک عرصے تک اِس مکان میں بغیر فرشی وعرشی پنکھے کے رہے۔ اس کے بعد جب بندے (مفتی خلیل صاحب) کی خدمت کا سلسلہ شروع ہوا تو والد صاحبؒ نے میری دو ماہ کی تنخواہ جمع کر کے گھر میں ایک پنکھا لگایا، جو تا دمِ حیات والد صاحبؒ کے مکان میں لگا رہا۔

حضرت الاستاذؒ کے اِس عمل سے ہمیں یہ عبرت لینی چاہیے کہ ہمارا ذاتی تقاضہ اگر کبھی پورا نہ ہو تو اس پر شکوہ شکایت نہیں ہونی چاہیے، صبر واستقامت سے کام لینا چاہیے۔

آپؒ انتہائی شوق ولگن، تندہی وجفاکشی اور استقامت وثباتِ قدمی کے ساتھ اِس جامعہ میں تقریباً سینتالیس سال تک خاموش وبےلوث خدمات انجام دیتے رہے۔ اِس طویل عرصے میں کئی مرتبہ عہدۂ مشیخیت اور سامانِ آسائش وآرائش خود سپردگی کے عالم میں آپؒ کے سامنے آکر دست بستہ کھڑے ہوئے؛ لیکن آپؒ نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

ایک مرتبہ آپؒ کے لائق فائق، نیک کردار صاحب زادے، شیخ الحدیث حضرت مفتی خلیل صاحب دامت برکاتہم نے آپؒ کی خدمتِ اقدس میں حاضر

ہو کر بہ صد عاجزی درخواست کی کہ: کاوی میں میرا نیا تعمیر شدہ مکان آپ کا منتظر ہے، آپ وہیں تشریف لے آیئے!۔ اِس پر آپؒ نے بڑے جذب کے عالم میں فرمایا کہ: ''بھائی! میں تو یہاں حدیث شریف پڑھا رہا ہوں، وہاں جا کر کیا کروں گا؟ اس پر مفتی خلیل صاحب دامت برکاتہم نے عرض کیا کہ: آپ وہاں رہ کر بھی قرآن وحدیث کا درس دے سکتے ہیں۔ تو اِس پر آپؒ نے بڑا پیارا جواب دیا کہ: ''ہاں! ٹھیک ہے! لیکن میں نے تو یہ ارادہ کرلیا ہے کہ اب-ان شاء اللہ- میرا جنازہ جامعہ ڈابھیل ہی سے اٹھے گا، میں کبھی بھی جامعہ کو نہیں چھوڑ سکتا''۔ اِس جواب کو سن کر مولانا خلیل صاحب دم بخود رہ گئے اور دوبارہ کبھی کاوی تشریف لے چلنے کی درخواست نہ کی۔

آپؒ کی دنیا سے بے اعتنائی و بے نیازی اور پہلو تہی و کنارہ کشی کو سمجھنے کے لیے آپؒ کا یہ قول کافی ہے: ''پیسوں کو گنا مت کرو؛ کیوں کہ یہ عمل برکت کو ختم کردیتا ہے''۔

بہلول کا قول سنا تھا کبھی ہم نے ۔۔۔ جو دین کو رکھتے ہیں، وہ دنیا نہیں رکھتے
یعنی کہ جو دین دار ہیں وہ دین کے آگے ۔۔۔ دنیا کی کسی شیٔ کی تمنا نہیں رکھتے
کرنے کو تو وہ کرتے ہیں دنیا کے بکھیڑے ۔۔۔ پر اَٹکا ہوا اُن میں دل اپنا نہیں رکھتے
محنت سے مشقت سے کماتے ہیں کمائی ۔۔۔ دامانِ طلب حد سے زیادہ نہیں رکھتے

حاصل یہ ہے کہ دنیا میں گذر کرتے ہیں دین دار
اِس شکل سے جیسے کہ وہ دنیا نہیں رکھتے

صبر وتحمّل

استاذِ محترم بے انتہا صابر وحلیم اور بڑے وسیع الظرف تھے، کبھی کسی پر غصہ نہیں فرماتے تھے، طلبہ کی شرارت پر عفو ودرگذر کا قلم پھیرنا تو آپؒ کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ذرا اندازہ لگائیے! بعض طلبہ دھڑلے سے بڑی پابندی کے ساتھ گھنٹہ شروع ہونے کے تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد درس گاہ میں داخل ہوتے؛ مگر آپؒ نے کبھی کسی سے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ بسا اوقات تو درسگاہ کا یہ منظر دیکھنے کو ملتا کہ ایک طرف تو آپؒ درسِ حدیث کا جام لنڈھا رہے ہیں، اور دوسری طرف بعض طلبہ غفلت میں ہیں۔ یہ سارا منظر آپؒ کی نگاہوں کے سامنے ہوتا؛ مگر اس کے باوجود وسیع الظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کبھی کسی سے ایک لفظ نہ کہتے۔

اِسی طرح اگر آپؒ کبھی کسی طالبِ علم کو کوئی کام سپرد کرتے اور وہ اُس کام کو آپؒ کے منشا کے خلاف کرڈالتا، تب بھی آپؒ غصہ پی جاتے اور کوئی حرفِ شکایت زبان سے نہ نکالتے۔

چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے: آپؒ نے ایک طالبِ علم کو جمعہ کے دن ''نوساری'' بھیجا کہ: آپ وہاں سے ''لیوٹا'' مچھلی لے آیئے! اور اپنی عادت کے مطابق بالتفصیل ہر ہر جز کو اس کے سامنے ذکر کردیا، وہ طالبِ علم گیا اور تقریباً بارہ بجے نوساری سے واپس آکر کہتا ہے کہ: استاد جی! مچھلی نہیں ملی۔ آپؒ نے دریافت فرمایا کہ: اچھا! یہ بتایئے کہ آپ نے مچھلی کا نام کیا بتایا؟ اس بے چارے نے ''لیوٹا''

کے بجائے ''ٹیولا'' بتایا۔ تب آپؒ نے اپنے لبوں پر مسکراہٹوں کا گلدستہ سجاتے ہوئے کہا: ''جناب! آپ نے تو پوری لغت ہی بدل ڈالی! مچھلی کیسے ملے گی!''۔

الغرض! آپؒ واقعتاً ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ کا مجسم نمونہ تھے۔

تواضع وانکساری

خدائے وہّاب نے آپؒ کی ذات میں عاجزی وخاکساری کا جو وصف ودیعت فرمایا تھا، ایسا لگتا تھا کہ آپؒ کا خمیر ہی کسرِ نفسی اور تواضع سے گوندھا گیا ہے، آپؒ کی چال ڈھال، اقوال وافعال، نشست وبرخواست، خلوت وجلوت؛ حتی کہ آپؒ کے اَنگ اَنگ سے تواضع ٹپکتی تھی؛ غرض یہ کہ آپؒ تواضع وانکساری کا مجسمہ تھے۔

اِس وقت جب کہ میرے ہاتھ میں قلم ہے، میں حیران ہوں کہ قارئین کی خدمت میں کتنے نمونے پیش کروں؟ مزید یہ کہ ''سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ چھیڑوں داستاں کیسے؟''

ایک مقولہ سن رکھا ہے ''المعاصرۃ تُورِثُ المنافرۃَ'' کہ جہاں معاصرت ہوتی ہے، وہاں عموماً کچھ نہ کچھ کھینچا تانی ضرور رہتی ہے۔ مگر جب حضرت الاستاذؒ کے تواضع کی بات آتی ہے تو یہ مقولہ پاش پاش ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ حضرت مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم جس زمانے میں یہاں پڑھاتے تھے اُس زمانے میں استاذِ مرحومؒ بھی آپ کے جلو میں رہ کر خدمات انجام دیتے تھے۔ ان

دونوں بزرگوں کے بیچ بڑے اچھے روابط تھے۔ ایک مرتبہ خود انھوں نے حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم العالیہ سے فرمایا کہ: ''مولانا یوسف صاحبؒ میں تواضع بہت تھی اور اس کے بیسیوں نمونے ہم نے اپنی زندگی میں دیکھے، کبھی بھی اُن کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا کہ جس سے اُن کی اپنی کوئی شان ٹپکتی ہو''۔

حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ:

''چند سال پہلے جب حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری -ادام اللہ فیوضھم علینا- کی منگل کی مجلس شروع ہوئی، تو ایک لمبے زمانے تک مولاناؒ آ کر مجلس کی آگے والی جگہ میں بیٹھتے تھے، دوسروں کا تو معلوم نہیں ہے، لیکن میں اپنی بات بیان کر سکتا ہوں کہ مولاناؒ نہ حضرت کے مرید تھے نہ حضرت؛ مولاناؒ کے شیخ ہیں؛ بلکہ مولاناؒ کے شیخ تو فقیہ الامت حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہی (م ۱۴۱۷ھ) تھے۔ حضرت مفتی صاحب کا تعلق چوں کہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے تھا، بس اُسی نسبت پر استفادے کی غرض سے آگے بیٹھتے''۔

آگے پڑھیے! ایک طالبِ علم نے واقعہ سنایا کہ: میں مولاناؒ کی خدمت کرتا تھا اور عصر کی چھٹی کے بعد اور مغرب کے بعد مولوی کامل سورتی کے گھر سے کھانا لانے کی خدمت میرے سپرد تھی۔ جب پہلی مرتبہ میں دوپہر کی چھٹی کے بعد مولاناؒ کے گھر جا رہا تھا تو جامعہ کے دربان نے مجھے جانے سے روک دیا۔ میں نے

کہا کہ: میں مولانا یوسف صاحب کی خدمت کرتا ہوں، مولاناؒ کے گھر جار ہا ہوں۔ اِس پر وہ ناسمجھ دربان اول فول بکنے لگا کہ: وہ مولانا بھی سوسو خادم رکھتے ہیں......!! اِتنے میں مولاناؒ کا دوسرا قدیم خادم وہاں پہنچ گیا اور مولاناؒ کے متعلق دربان نے جو جملہ کہا تھا اُس پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ بالآخر دربان نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں مولاناؒ کے گھر پہنچا اور چوں کہ کافی دیر ہو چکی تھی؛ اس لیے مولاناؒ نے دریافت کیا کہ: ''کیا بات ہے؟ بہت دیر ہو گئی؟'' میں نے مولاناؒ کو ساری تفصیل بتلادی۔ میرے ساتھ وہ پرانا خادم بھی تھا، مولاناؒ نے ہم دونوں کو بٹھایا اور خوب سمجھانے لگے کہ: ''وہ بے چارہ دربان پڑھا ہوا نہیں ہے، ہم لوگ پڑھے ہوئے ہیں اور علم حاصل کر رہے ہیں، کبھی کسی پر غصہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم دونوں ابھی واپسی میں جاتے وقت دربان سے معافی مانگ لینا''۔ پھر اُس کے بعد مولاناؒ نے دربان کے نام ایک خط لکھا، اُس خط کی دو باتیں مجھے (صاحبِ واقعہ طالبِ علم) یاد ہے، اُس میں لکھا تھا: ''دربان صاحب! میں دونوں پیروں سے معذور ہوں، اپنے پاؤں کی لاچاری کی وجہ سے خادم رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے'' آگے کا جملہ ذرا دھیان سے پڑھیے گا! ''دربان صاحب! مجھے معاف کر دینا اور اپنی دعا میں مجھے یاد رکھنا۔ دعا کا طلبگار: یوسف ڈیپوٹی جامعہ ڈابھیل''۔

اتنا ہی نہیں بلکہ دو چار روز کے بعد مولاناؒ نے اُس دربان کو پانچ سو روپے بھی ہدیے میں بھجوائے اور کہا: ''دعا میں یاد رکھنا''۔

طلبہ سے دعا کروانے کا عجیب معمول

مولاناؒ کی من جملہ خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت ایسی تھی کہ شاید وباید ''ہزاروں میں ایک'' ایسا نکل آئے جس کے اندر یہ خوبی پائی جاتی ہو۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ کے دل میں تواضع وانکساری کتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، نیز آپؒ کا دل طلبہ کی عظمت ووقعت سے کس قدر لبریز تھا!

آپؒ کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی بڑا سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ پیش آتا، مثلاً: گھر میں کوئی بیمار ہے، کسی کا آپریشن ہے، ڈاکٹری رپورٹ خلافِ توقع آ گئی، کسی کا کہیں سفر ہے، کوئی سفر سے آ رہا ہے، کسی کا ویزا ختم ہو گیا ہے اور اُسے امیگریشن آفس جانا ہے، کسی کا امتحان جاری ہے، گھر میں کوئی چیز- چاہے وہ بڑی اور اہم ہو یا چھوٹی اور معمولی- گم ہو گئی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ تو آپؒ طلبہ کے نام ایک لمبی چوڑی درخواست لکھتے تھے اور انتہائی عجز ونیاز کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی لجاجت کے ساتھ دعا کی درخواست کرتے تھے۔

اِس وقت راقم الحروف کے پاس ایسی بیسیوں- چھوٹی بڑی- تحریریں اور درخواستیں (جو خود آپؒ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں) موجود ہیں جو بندے کو آپؒ کے وصال کے بعد آپؒ کے ایک خادمِ خاص: مولوی محسن لوناولا (فاضلِ جامعہ ڈابھیل) کے توسط سے حاصل ہوئی ہیں۔ تمام درخواستوں کو نقل کرنا تو ممکن نہیں؛ البتہ نمونۂ عمل کے لیے چند ایک درخواست قارئین کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں:

﴿۱﴾ دعاؤں کی گزارش:

[الف] ناچیز یوسف احمد کاوی اور اہلیہ؛ ہم دونوں کا سالانہ تعطیلات میں غیر ملکی سفر (افریقہ) جانے کا -ان شاء اللہ- ارادہ ہے، اس کے لیے کاغذات ضروری ہے، داعی کی طرف سے بھی کاغذات اور ہمارے انڈیا کے بھی کاغذات ہونا ضروری ہے، تو دعا فرماویں، اللہ تعالیٰ کاغذات کا غیب سے سہولت کے ساتھ انتظام فرمادے، تمام صحیح صحیح کاغذات مل جاویں۔ اور یہ کاغذات -ان شاء اللہ- افریقہ کی ''ایم بی سی'' میں داخل کریں گے تو دعا فرمادیں کہ کاغذات قبول ہو اور جو ویزا دینے والا بڑا آفیسر ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ رحم ڈال دے اور ہم دونوں کو آسانی کے ساتھ ویزا مل جائے۔ دوسری دعا یہ بھی فرماویں کہ: دونوں کی آمد ورفت کا خرچ ایک لاکھ کے قریب ہے، اللہ تعالیٰ ٹکٹ کا انتظام غیب سے مہیا فرماوے اور ہم دونوں خیر وعافیت سے افریقہ پہنچ جائیں اور خیر وعافیت کے ساتھ پھر واپس انڈیا ڈابھیل آجاویں۔

[ب] ہماری اہلیہ اور ہمارے مولانا خلیل صاحب؛ دونوں کا عید الفطر کے بعد ان شاء اللہ حج بیت اللہ جانے کا اِرادہ ہے تو دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ دونوں کے لیے حج بیت اللہ مقدر فرماوے، سالِ رواں حج نصیب فرماوے اور دونوں کے لیے ٹکٹ کرایہ کا انتظام فرماوے۔ دونوں کے حج کی مراد پوری فرماوے۔

[ج] دعا یہ کہ ہمارے مولانا خلیل احمد صاحب کا پاسپورٹ، بمبئی یو-کے انگلینڈ ''ایم بی سی'' میں روک دیا گیا ہے۔ ۲/سال کے ویزا کے لیے پاسپورٹ

آفس میں جمع کرایا تھا، دس ماہ سے روک رکھا ہے، دیتے نہیں ہیں، پچیس ہزار فیس بھی جمع کرائی ہے۔ آپ حضرات دعا فرماویں کہ جلد از جلد پاسپورٹ ویزا لگا کر مولانا خلیل صاحب کو دے دیں؛ اس لیے کہ عید کے بعد حج میں جانا ہے۔

[د] دعا خاص میری صحت کے لیے فرماویں، اللہ تعالیٰ مجھے صحتِ کلیّہ عاجلہ مستمرّہ عطا فرما کر صحت، قوت، ہمت اور شفائے تام عطا فرماوے، بہت سارے امراض ہیں، شوگر، بلڈ پریشر، ہارٹ (دل) کی بیماری میں اعتدال (نورمل) فرماوے۔ اللہ تعالیٰ دواؤں کے پیسے کا غیب سے انتظام فرماوے، اللہ تعالیٰ درس وتدریس کے لیے عمر میں برکت پیدا فرماوے، خاتمہ ایمان پر فرماوے۔ یہی صحت کی دعا اہلیہ کے لیے بھی فرماویں۔

آپ حضرات سے عاجزانہ التماس ہے کہ تہجد کے موقع پر اور جمعہ کے خطبے کے وقت اور پانچوں نمازوں کے بعد ضرور سالانہ امتحان تک برابر او پر والی دعا کرتے رہیں، اعتکاف میں ضرور دعا فرماویں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر اور اجرِ جزیل عطا فرماوے، ہمارے جملہ اہلِ خانہ: خلیل، رشید، سعید، عبد الرحمٰن، مسعود، زکریا، شاکرہ؛ ان کے بال بچوں کے لیے، اولاد کے لیے دین دنیا کی بھلائیوں کی دعا فرماویں۔ فقط والسلام

یوسف احمد کاوی مظاہری

مقیم عربی مدرسہ ڈابھیل

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ مطابق: ۱۴/ مارچ ۲۰۱۳ء یوم الخمیس

﴿۲﴾ دعاؤں کی گزارش:

السلام علیکم! حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہمارے فرزند مولانا خلیل احمد صاحب زید مجدہ ایک عرصے سے علیل چل رہے ہیں، بہت سارے امراض کے شکار ہیں: شوگر، بلڈ پریشر، ہارٹ؛ دیگر امراض بھی ہیں، شوگر زیادہ ہے، دیگر امراض حدِّ اعتدال پر ہیں؛ لیکن سب بارڈر پر ہے، ضعف وکمزوری زیادہ ہے، دعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ صحتِ کلیّہ عاجلہ مستمرّہ عطا فرماوے، صحت، ہمت، قوت، عافیت عطا فرما کر دین کی خدمت کے لیے قبول فرماوے۔ اُن کے ذمے بخاری شریف، مسلم شریف، دار الافتا: ان کتابوں کے پڑھانے، مطالعہ کرنے میں، درسگاہ، مسجد کی حاضری کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق، مدد، اعانیت، تائیدِ ایزدی شاملِ حال فرماوے، اللہ تعالیٰ دواؤں کا غیب سے انتظام فرماوے۔ ہمارے سب پوتوں، احفاد، اسباط، بہوؤں؛ سب کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ عالم باعمل، قاریٔ قرآن، حافظِ قرآن اور دین کا داعی بناوے، سب کو صحت وشفائے تام عطا فرماوے۔

میرے لیے خاص دعا فرماویں، میرے ذمے مسلم شریف (کامل) اور مشکوٰۃ شریف، آثار السنن، ریاض الصالحین، الفوز الکبیر ہے، اللہ تعالیٰ پڑھنے پڑھانے میں، مطالعہ کرنے میں، درسگاہ نیز مسجد کی حاضری کے سلسلے میں پابندی اور غیبی اعانت فرماوے، اخلاص عطا فرماوے، اللہ تعالیٰ عمر میں برکت عطا

فرماوے، خاتمہ ایمان پر فرماوے۔

فقط والسلام

یوسف احمد کاوی غفرلہ مظاہری

مدرسہ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات

۸ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ۔ ۲۱ / مارچ، ۲۰۱۳ء، جمعرات

﴿۳﴾ دعاؤں کی گزارش:

ہمارے ایک پوتے حافظ ابراہیم سلمہ مدرسہ نقیب الاسلام کاوی ضلع: بھروچ میں ہدایہ عربی پنجم پڑھتے ہیں، اُن کا امتحانِ ششماہی جاری ہے، دعا فرماویں امتحان میں اعلیٰ کامیابی عطا فرماوے اور عالمِ باعمل اور دین کا خادم بناوے، علومِ عالیہ واخلاقِ حسنہ کی دولت سے مالا مال فرماوے۔

فقط والسلام

یوسف کاوی غفرلہ (مقیم مدرسہ ہذا)

۵ / ربیع الاول، منگل

﴿۴﴾ دعاؤں کی گزارش:

ہمارے گھر ایک چھوٹا سا مشین (آپریٹر) گم ہوگیا ہے، بہت ضروری ہے، دعا کیجیے! اللہ تعالیٰ ملوا دے، دو رکعت صلاۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا کریں۔

۲۶ / ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ مطابق: ۱۳ / اکتوبر ۲۰۱۳ء شبِ جمعہ

﴿۵﴾ دعاؤں کی گزارش:

دادی اماں [مولاناؒ کی اہلیہ] کی طبیعت خراب ہے، دو رکعت صلاۃ الحاجۃ پڑھ کر شفا کی دعا کریں، بخار، بدن کا درد، سر کا درد، بے چینی وغیرہ کی وجہ سے صاحبِ فراش ہے۔

اولاً گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھے۔ ثانیاً "یَابَدِیعَ الْعَجَائِبِ بِالْخَیْرِ یَا شَافِي" بارہ سو مرتبہ۔ اخیراً گیارہ مرتبہ درود شریف، پھر شفا کی دعا کریں۔

چار آدمی آپس میں تقسیم کرلیں اور پڑھیں، ہر ایک کے لیے تین سو تین سو مرتبہ آوے گا۔ ۶/ربیع الآخر ۱۴۳۵ھ بروز جمعہ

﴿۶﴾ دعاؤں کی گزارش:

آئندہ کل جمعرات کی دوپہر کو -ان شاء اللہ- سفر ہے، دعا کیجیے: اللہ تعالیٰ سفر میں مدد فرماوے، راستے کے شرور وفتن سے محفوظ فرماوے، پیشاب کا تقاضہ بار بار ہوتا ہے، اُس پر قابو یافتگی فرماوے، کپڑے وبدن کی طہارت اللہ تعالیٰ باقی رکھے، اللہ تعالیٰ ہر جگہ ملاقات کے لیے پہنچادے۔ اور جمعہ کے دن مغرب یا عشا کے وقت جامعہ ڈابھیل میں پہنچادے، بہ آسانی پورے سفر میں جان مال، عزت، آبرو کی حفاظت فرماوے۔ اللہ تعالیٰ حَرَق، غَرَق، تَرَدِّی سے محفوظ فرماوے۔ میری صحت کے لیے دعا فرماویں، گھٹنوں میں درد رہتا ہے، شفائے کلیہ عاجلہ مستمرّہ عطا فرماوے، صحت، قوت، ہمت، عافیت عطا فرماوے۔ شبِ جمعہ

اور یومِ جمعہ میں دعا کا خاص اہتمام فرمائیں۔ عین نوازش۔ شکریہ!

فقط

یوسف کاوی غفرلہ (جامعہ ڈابھیل)

۱۷/ جمادی الاولیٰ، یوم الاربعاء

قارئینِ کرام! غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک حدیث کا پڑھانے والا کتنی عاجزی وانکساری کے ساتھ کسی اور کی خدمت میں نہیں؛ بلکہ اپنے شاگردوں اور طلبہ کی خدمت میں نیز صرف بڑے ہی امور میں نہیں؛ بلکہ حقیر سے حقیر شئ کے گم ہونے پر بھی اس طرح کی درخواستیں بھیج کر دعا کروا رہا ہے۔ سچ ہے: "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ" اور بس!۔

اندازِ تربیت

حضرت سلمان فارسیؓ کی مشہور حدیث کا خلاصہ ہے کہ: ایک مرتبہ مشرکین نے ان کے سامنے یہ اعتراض کیا کہ: تمھارے محمد کیسے ہیں کہ وہ تمھیں ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتلاتے ہیں جن کو بچپن میں ماں باپ سکھایا کرتے ہیں؟! تو حضرت سلمان فارسیؓ نے جواب دیا تھا کہ: ہاں! ہمارے پیغمبر تو ہمیں (بڑی بڑی چیزوں کی تعلیم تو دیتے ہی ہیں؛ مگر) چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی سکھلاتے ہیں؛ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے روحانی باپ ہی تو ہیں۔

چنانچہ جس طرح ایک مشفق ومہربان باپ اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر کی

تربیت زندگی کے ہر مرحلے پر کرتا ہے، چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کی تعلیم دیتا ہے اسی طرح ہمارے مشفق ومہربان استاذ - جو یقیناً نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سچے وارث تھے- صرف تعلیمی محاذ ہی پر تربیت نہیں فرماتے تھے؛ بلکہ دینی تربیت کے ساتھ دنیوی تربیت کا بھی بڑا اہتمام فرماتے تھے۔تو لیجیے! آپ کے سامنے حضرت الاستاذؒ کی تربیت کی ایک جھلک پیشِ خدمت ہے:

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ: ہماری تعلیم وتربیت میں حضرتؒ کا عجیب انداز رہا، میں فارسی دوم کا طالبِ علم تھا، اُس زمانے میں انفعالی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ استاذ کے سامنے عبارت نہیں پڑھ سکتا تھا، ہمارے والد صاحبؒ بار بار تقاضا کرتے تھے کہ ’’عبارت پڑھو‘‘ اور ہمارے شیخ مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ کے پاس جب جاتا، خیریت دریافت کرتے اور اس کے بعد کہتے کہ: ’’عباس! عبارت پڑھو، عبارت پڑھتے ہو کہ نہیں؟‘‘ اور میری حالت یہ تھی کہ استاذ کے سامنے پڑھ ہی نہیں پاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ فارسی دوم میں مولانا عبدالاول صاحب کے پاس پڑھتا تھا، والد صاحب تقاضا کرتے تھے؛ مگر پورے سال میں ’تاریخِ اسلام‘ کی صرف ایک مرتبہ عبارت پڑھی اور اس میں بھی اِتنا ڈر گیا کہ اِدھر سے اُدھر کرنے لگا، تو مجھے بہت ڈانٹا کہ ’’ابھی تو اُردو نہیں پڑھ پاتا،‘‘ مالابدمنہ، گلستاں اور بوستاں‘‘ کی عبارت تو تُو نے کبھی پڑھی ہی نہیں، اُردو میں ہی تیرا ٹھکانا نہیں ہے‘‘ اس کے بعد تو پھر ہمت ہی ٹوٹ گئی۔

پھر عربی اول میں پہنچا تو ایک مرتبہ ہمارے والد صاحبؒ ہمارے استاذ مولانا رشید احمد کیاتؒ کے پاس آئے اور کہا کہ: اِس سے عبارت پڑھواؤ۔ مولاناؒ خوب تاکید کرتے تھے؛ مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے سال میں ایک مرتبہ ''کتاب الصرف'' کی عبارت پڑھی۔

جب عربی اول پورا کر کے عربی دوم میں پہنچے، تو وہاں 'نور الایضاح' کا سبق حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کے پاس آیا، پہلے دن بہت ساری نصیحتیں کیں، اور اس کے بعد فرمایا کہ: ''ہر طالبِ علم کو عبارت پڑھنی پڑے گی'' میں نے سوچا کہ اب یہاں کیسے چلے گا؟ میں بالکل سامنے بیٹھتا تھا، چنانچہ باری ایک لائن سے شروع ہوئی تو میں نے اندازہ لگایا کہ میری باری فلاں دن آسکتی ہے اور یہ حصہ آنے والا ہے، تو چھٹی کے بعد اور مغرب وعشا کے بعد جس طریقے سے مشق کرتے ہیں اسی طریقے سے میں 'نور الایضاح'' کی عبارت مشق کرنے لگا، کئی دن تک میں نے اس طرح کئی صفحات کی مشق کرلی اور مولاناؒ کا عجیب معمول تھا کہ عبارت پڑھتے ہوئے پکڑ بہت سخت کرتے تھے۔ اب میں نے مشق کر کے تیاری کرلی اور جس دن میرا نمبر آیا تو بے تکلف پڑھ گیا، مجھے یاد ہے کہ حضرتؒ نے کہیں نہیں ٹوکا۔

بس! حضرتؒ کا تصرف تھا یا روحانی توجہ تھی کہ پھر ہر کتاب کی عبارت بلا تکلف پڑھنے لگا اور حضرتؒ ہی کی توجہ کی برکت تھی کہ پھر کبھی کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوئی''۔

ایک اور واقعہ بھی خود حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم ہی کے حوالے سے پڑھتے چلیے!

''ذرا مولاناؒ کی تربیت کا انداز دیکھیے! ہم نور الایضاح پڑھ رہے تھے، اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ مَیں نے عصر کی نماز اپنے محلّے کی مسجد میں ادا کی، نماز کے بعد میں اپنے ایک چچا زاد بھائی کے ساتھ تالاب کی طرف نکلا اور وہاں راستے پر جو بیٹھک تھی اُس پر جا کر بیٹھ گیا۔ خلافِ معمول ہوا یہ کہ اُس دن سملک میں ایک تقریب تھی، جس میں جامعہ کے اساتذہ کی دعوت تھی، تو بعض اساتذہ عصر کی نماز سے پہلے ہی نکل گئے اور بعض عصر کی نماز یہیں جامعہ میں پڑھ کر نکلے۔ میں وہیں بیٹھک پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک مولاناؒ کا وہاں سے گذر ہوا، مولاناؒ نے بھی مجھے دیکھا اور میں نے بھی مولاناؒ کو دیکھا۔ اُس وقت تو مولاناؒ گذر کر سملک چلے گئے؛ لیکن جب دوسرے دن سبق میں تشریف لائے اور سبق پڑھایا تو خلافِ معمول گھنٹی سے پانچ چھ منٹ پہلے ہی سبق بند کر دیا، سبق بند کرنے کے بعد فرمایا:

''بعض لوگ راستے کے کناروں کے اوپر بیٹھے رہتے ہیں اور نامحرم عورتوں پر نظر ڈالتے رہتے ہیں، یہ طریقہ ہمارا نہیں، طالبِ علم کا یہ طریقہ نہیں ہے''۔

سبق پڑھانے کے بعد اخیر میں مولاناؒ کا یہ کہنا؛ اور لوگوں کو تو سمجھ میں آیا نہیں؛ مگر میرے دل کے اوپر چوٹ لگی اور بس اُس دن سے۔الحمدللہ۔آج تک کبھی بھی بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی۔ آج بھی اُس جگہ جاتا ہوں؛ مگر وہاں بیٹھنے کی

ہمت نہیں ہوتی، اُستاذ کا یہ جملہ آج تک دل کے اوپر نقش ہے''۔ انتھیٰ

اس واقعے میں اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ آپؒ کا اندازِ تربیت بعینہ وہی تھا جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں روایتوں میں وارد ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''مَابَالُ أَقْوَامٍ، مَا بَالُ رِجَالٍ'' کے مبہم جملے سے اس طرح تربیت فرماتے تھے کہ اصلاح کی اصلاح بھی ہو جائے اور کسی کی عزتِ نفس کو ٹھیس بھی نہ پہنچے۔

حضرت موصوف ہی بیان فرماتے ہیں کہ: ''ایک مرتبہ شعبان کے مہینے میں حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ کے ساتھ دیوبند جانے کا پروگرام طے ہوا، تو میں مولاناؒ کے پاس ملنے کے لیے گیا، کہ ''جلال آباد'' اور ''دیوبند'' جانا ہے۔ تو مولاناؒ نے بڑی دعائیں دیں اور پھر فرمایا کہ: ''دیکھو! تمھارے شیخ ''مولانا مسیح اللہ صاحبؒ'' ہیں اور تم اپنے شیخ کے پاس جانا چاہتے ہو تو پہلے دیوبند مت جانا؛ بلکہ پہلے جلال آباد جانا، اپنے شیخ سے مل لینا اور پھر اس کے بعد دیوبند جانا'' اور پھر فرمایا کہ: ''جب شیخ کے پاس پہنچو تو سیدھے شیخ کے پاس جاؤ، کسی اور کے پاس جا کر پھر شیخ کے پاس پہنچنے سے اگر شیخ کے دل میں ادنیٰ سا تکدر پیدا ہوا تو فیض سے محروم ہو جاؤ گے''۔

اسی طرح تربیتی سلسلے کا ایک اور واقعہ ذرا ادیبِ جامعہ مفتی عرفان صاحب مالیگانوی زید مجدہ کی زبانی بھی ملاحظہ فرماتے چلیں:

''عربی پنجم کے بعد عربی ششم سے پہلے سالانہ تعطیلات میں بندے (مفتی عرفان صاحب) کا دیوبند جانے کا پروگرام بنا۔ میں نے حضرتؒ کی خدمت

میں عرض کیا کہ: حضرت! ہمارا دیوبند جانے کا پروگرام ہے، ٹکٹ بن گیا ہے۔ تو مولاناؒ نے کہا کہ: اچھا ٹھیک ہے! آپ مکان پر تشریف لایئے۔

اُس وقت مولاناؒ کے صاحب زادے برادرِ مکرم مولوی مسعود صاحب - ہمارے حفظ کے ساتھی ہیں - دیوبند میں درجۂ عربی چہارم پڑھ رہے تھے، تو مولاناؒ نے کہا کہ: میں بھائی مسعود کے لیے کچھ رقم اور سامان دوں گا، آپ جب دیوبند جائیں تو اُن کو پہنچا دینا۔

جب میں سفر میں نکلتے وقت مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولاناؒ نے کہا: جا رہے ہیں؟ میں نے کہا: جی حضرت! فرمایا کہ: ہم آپ کو پیسہ دیں گے تو آپ کہاں رکھیں گے؟ میں نے کہا کہ: یہاں جیب میں۔ فرمایا کہ: یہاں سے تو کوئی بھی نکال لے گا! آپ نے کبھی ٹرین میں سفر کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں حضرت! یہ پہلا سفر ہے۔ فرمانے لگے: اوہو! تو آپ کو ٹرین میں سفر کرنے کا تجربہ بھی نہیں ہے، سفر ایسے نہیں کیا جاتا۔ آپ دہلی جائیں گے، دہلی میں ٹھگ بہت......، وہ آپ سامان رکھ کر اِدھر دیکھیں گے، اتنے میں تو وہ سامان غائب! تو ایسے نہیں رہنے کا۔ میں نے کہا: پھر حضرت! کیا کریں؟ فرمایا کہ: جیب والا بُنیان لایئے، جیب والا بنیان ہے؟ میں نے کہا: نہیں حضرت! جیب والا بنیان تو کبھی نہیں پہنا۔ ......تو جایئے! لے کر آیئے۔ میں اُسی وقت ''اُون'' گیا اور وہاں سے جیب والا بنیان خریدا۔ اور پھر حاضرِ خدمت ہوا تو پوچھا کہ: پہن کر آئے ہو؟ میں نے کہا: جی

حضرت! تب جا کر حضرتؒ نے وہ رقم مجھے دی کہ یہ جیب والے بنیان میں جو رقم مسعود کو دینی ہے اس کو رکھیے اور یہ سامان اپنے بیگ میں رکھیے اور پھر وہاں جا کر دے دیجیے!''

قارئینِ کرام! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اِتنی چھوٹی سی بات اتنی اہمیت کے ساتھ کیوں بیان کی جا رہی ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ: ذرا رُکیے! اتنی جلدی سوالیہ نشان قائم مت کیجیے! ذرا آگے بھی پڑھیے:

''اس سے حضرت نے یہ سکھا دیا کہ سفر میں اپنے پیسوں کی حفاظت کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ کے پاس جیب والا بنیان ہو اور آپ اس میں پیسے رکھیں؛ یہ سب سے زیادہ محفوظ رہے گا۔ اِس عادت کو میں نے اختیار کر لیا۔

اس کے بعد موقع بہ موقع ہونے والے سفر میں مَیں ہمیشہ اپنے ساتھ جیب والا بنیان رکھتا تھا۔ جامعہ سے فراغت کے بعد اللہ کے فضل وکرم سے جب دار العلوم دیوبند میں جا کر پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور وہاں کا قیام ہوا۔ تو ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ- میں چوں کہ دار العلوم کے باہر اور وہ بھی اکیلا کمرے میں رہتا تھا- باقاعدہ تالا توڑ کر کمرے میں چوری کی گئی۔ میرے پاس صرف ایک پیٹی، ایک چارپائی اور اس کے اوپر کچھ معمولی بستر بچھے ہوئے ہوتے تھے۔ اتفاق سے میں وہی جیب والا بنیان پہنا ہوا تھا اور ساری رقم اپنے اُسی جیب میں رکھے ہوئے تھا۔ اب وہ چور پیٹی اٹھا کر لے گیا، جا کر کے بے چارے نے تالا توڑ کر

دیکھا ہوگا کہ اس میں ''جلی ہوئی موم بتی، ماچس''، کچھ ''پھٹی ہوئی گدڑی'' اور کچھ ''کتابیں'' رکھی ہوئی تھیں، تو بے چارہ بہت پچھتایا ہوگا؛ اس لیے اُس بے چارے نے خود ہی لاکر پیٹی دے دی اور اقرار بھی کیا کہ: میں نے چُرائی تھی۔ اُس کے چُرانے سے - الحمدللہ - مجھے ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا؛ اس لیے کہ رقم تو میرے جیب والے بنیان میں تھی''۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ: آپؒ نے زندگی کا ایک ایسا اصول ہاتھ میں تھما دیا کہ جس کا فائدہ انسان قدم قدم پر محسوس کرسکتا ہے۔

فتنہ وفساد سے کنارہ کشی

پانچ دہائیوں پر مشتمل آپؒ کی زندگی پر اگر ہم غائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو اتنے بڑے طویل عرصے میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ جس میں آپؒ کی شخصیت پر بدنظمی، نزاع واختلاف اور فتنہ پروری کے تعلق سے انگلی رکھی جاسکے۔ ذیل میں ہم ایک آدھ نمونہ قارئین کی تسلی کے لیے پیش کیے دیتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

شیخ القرا حضرت قاری احمد اللہ صاحب مدظلہ اپنے تعزیت نامے میں رقم طراز ہیں: ''......واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ بے ضرر انسان تھے، مدرسہ میں ایک طویل عرصے تک بہ حیثیت اُستاذ ہم دونوں ساتھ رہے؛ لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی کوئی رنجش کی بات پیش آئی ہو''۔

اسی طرح حضرت الاستاذ مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کا بیان ہے کہ: ''ایک چیز ہم نے مولاناؒ کی عجیب محسوس کی کہ (ڈابھیل وسملک) گاؤں کے اندر عجیب عجیب حالات آئے اور مولاناؒ کی پچاس سالہ جامعہ کی زندگی میں نہ جانے کیسے کیسے حالات آئے، گاؤں کے اندر لڑائیاں بھی بہت ہوتی تھیں؛ لیکن مولاناؒ کبھی گاؤں کے معاملے میں دخل انداز نہیں ہوئے، ایسا نہیں کہ مولاناؒ کو کچھ معلوم نہیں؛ بلکہ مولاناؒ تمام حالات سے واقف رہتے تھے، اس کے باوجود کبھی کسی معاملے میں دخل انداز نہیں ہوئے''۔

صبر واستقامت اور اوقات کی پابندی

ستر سالہ صحرانوری اور بادیہ گردی کے دوران آپؒ کو مصائب وتکالیف کے طوفان کا بھی سامنا کرنا پڑا اور شدائد وآلام کی قہر بار ہواؤں کا بھی؛ لیکن آپؒ کے آہنی قدم جادۂ استقامت سے نہ ہٹ سکے۔ آپؒ کی شخصیت یقیناً استقامت کی زندۂ جاوید مثال تھی، کسی ایک جگہ رہ کر اللہ کے دین کی خدمت میں عمر گزار دینا؛ ہر آدمی کے جگر گُردے کی بات نہیں ہے، خاص کر کے معاشی تنگ دستی اور دیگر احوال میں انسان کبھی ایسا اُچٹ جاتا ہے کہ اچھے اچھوں کی پابندی اور ثَباتِ قدمی متزلزل ہو جاتی ہے، یہ حضرتؒ کی خصوصیت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو استقامت کی دولت عطا فرمائی تھی۔

آپؒ کے صاحب زادے حضرت مفتی خلیل صاحب مدظلہ العالی فرماتے

ہیں کہ: ”آپؒ کا سب سے نمایاں وصف استقامت تھا، آپؒ جس چیز کو عادت بنا لیتے تھے، زندگی کے آخری لمحے تک کبھی اُس عادت کو چھوڑا نہیں، درس وغیرہ کی پابندی کی جو بات ہے وہ تو دور کی بات ہے؛ لیکن اپنی ذاتی عادتوں میں بھی آپؒ نے جس عادت کو اپنالیا زندگی بھر اُس کو نہیں چھوڑا۔

شروع زمانے میں جب عسرت وتنگی تھی، اُس وقت آپؒ کی جو سادگی تھی اور جو طرزِ زندگی آپؒ کا تھا، وُسعت کے بعد بھی آپؒ نے اُس طرزِ زندگی کو نہیں چھوڑا۔ مدرسے کی طرف سے جو مکان دیا ہوا ہے، تقریباً ۱۹۷۷ء میں ہم یہاں رہنے کے لیے آئے، آج لگ بھگ چالیس کا طویل عرصہ گذر گیا، جس جگہ پہلے دن پلنگ پر بستر رکھا تھا اور جس جگہ پہلے دن لیٹے تھے، آپؒ کی وفات بھی اُسی جگہ اور اُسی بستر کے اوپر ہوئی؛ گویا چالیس سال تک ایک ہی جگہ سوتے رہے۔

مسجد میں داخل ہونے کے لیے جو مشرقی جانب میں سیڑھی ہے آپؒ ہمیشہ اُن ہی سیڑھیوں سے تشریف لاتے؛ حالاں کہ اس طرف سے چڑھنا بھی بہت مشکل تھا۔ جب جنوب کی طرف والی سیڑھیاں بن گئیں جس سے آنا جانا بھی آسان تھا، تو ہمارے بھائی نے ایک مرتبہ والد صاحبؒ سے کہا کہ: آپ اس طرف سے تشریف لے جائیں، ادھر سے آسان ہے۔ تو والد صاحبؒ نے فرمایا کہ: نہیں! میرے لیے وہی ٹھیک ہے، زندگی بھر میں وہیں سے گیا ہوں، وہیں سے جاؤں گا اور آؤں گا۔ بس! جس چیز کو عادت بنالیا، زندگی بھر اُس کو اپنائے رکھا“۔ انتہیٰ

جہاں تک اوقات کی پابندی کا تعلق ہے تو یہ بھی حضرت الاستاذؒ کی بہت بڑی خصوصیت تھی، ہاں یہ ہوتا تھا کہ خارجی اوقات میں سے اپنے درس کے لیے وقت لیتے تھے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ درس کے اوقات میں حضرتؒ غائب رہتے ہوں۔

حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: ہم نے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ ''مشکوٰۃ شریف'' اور ''ہدایہ ثالث'' حضرتؒ کے پاس پڑھی۔ یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کے دل میں دردو کرب ہو، استقامت کا جوہر ہو اور جو اوقات کا محافظ ونگہبان ہو۔

بیماریاں تو جوق درجوق آپؒ کے آنگن میں آکر فروکش ہوتی رہتیں؛ لیکن آپؒ نہ چیں بہ جبیں ہوتے اور نہ اَورادووظائف اوراعمال واشغال سے غافل و بےخبر۔ بچپن میں جب چیچک کی بیماری آپؒ پرحملہ آور ہوئی اور گنجینۂ صبر واستقامت پر ڈاکہ زنی کی کوشش کی، تب آپؒ نے بڑی قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا، جس کے نتیجے میں ایک آنکھ کی بینائی وبصارت جاتی رہی؛ لیکن نہ دل سے صبر وشکیب کا ساتھ چھوٹا اور نہ ہاتھ سے تحمل وبرداشت کا دامن۔

جامعہ سے بے انتہا عشق او والہانہ لگاؤ

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل (جو آپؒ کا مادرِ علمی ہے) سے آپؒ کو بے حد عشق ومحبت اور والہانہ لگاؤ تھا جس کی طرف غمّازی کرنے کے لیے آپؒ کا یہ جملہ ہی کافی ہے کہ: ''میرا جنازہ تو جامعہ ڈابھیل سے ہی اُٹھے گا''۔

اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ آپؒ بارہا یہ فرمایا کرتے تھے کہ: جب میں حرمِ مقدس جاتا ہوں اور لوگوں کے پوچھنے پر یہ بتاتا ہوں کہ میرا تعلق جامعہ ڈابھیل سے ہے، تو لوگ کھڑے ہوکر مجھ سے معانقہ اور مصافحہ کرتے ہیں۔ اِسی طرح آپؒ کا انگلینڈ، افریقہ اور ویسٹ انڈیز جیسے مختلف ملکوں کا سفر بھی ہوا ہے، فرماتے ہیں کہ: ''ہر جگہ جامعہ کی نسبت پر لوگ میری عزت کرتے ہیں اور اس سے میری عزت بڑھ جاتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی عزت واکرام ہے، صرف اور صرف جامعہ کی برکت سے ہے''۔

حضرت الاستاذؒ کو جامعہ سے اتنا لگاؤ تھا کہ جامعہ کی چھوٹی سے چھوٹی ہر وہ چیز جس کو جامعہ کی ہَوا لگی ہو یا جامعہ سے اُس کی کسی نہ کسی درجے میں نسبت ہو، اپنے صاحب زادوں کو بڑے اہتمام کے ساتھ وہ چیز بھیجتے اور یہ فرماتے کہ: ''یہ چیز ہمارے جامعہ کی ہے، اُس کو سنبھال کر رکھنا''۔

چنانچہ جامعہ میں ہر سال دورۂ حدیث شریف کے طلبہ کا معمول ہے کہ سال کے اخیر میں بہ طورِ یادگار کوئی نہ کوئی چیز -کبھی شعبۂ تقریر وتحریر کے نام والی چابی کی رِنگ (چھلّا)، کبھی منقش تھیلی یا کوئی کتاب وغیرہ- پورے مدرسے میں تقسیم کرتے ہیں، اور اساتذہ کی خدمت میں بھی پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جب استاذِ مرحوم کی خدمت میں وہ چیز پیش کی جاتی تو آپؒ بڑی قدر کی نگاہ سے اُس کو ہاتھ میں لیتے اور پھر اپنے صاحب زادوں کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیتے تھے کہ: ''یہ

ہمارے جامعہ کی نشانی ہے، اس کو آپ رکھ لیں''۔

حضرت مفتی خلیل صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ:

''میں نے اپنے کانوں سے جامعہ ہذا کی، یہاں کے انتظامیہ کی کبھی کوئی برائی والد صاحب کی زبان سے نہیں سنی اور مدرسے کے باب میں ہمیشہ خیر خواہی ہی کرتے رہتے تھے''۔

آپؒ ہمیشہ جامعہ کے احسان شناس رہے۔ایک مرتبہ کچھ قریبی رشتے دار ملنے کے لیے آئے تو اُن کے سامنے بہت ہی لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ: ''اب تو میں بوڑھا ہو گیا، کمزور ہو گیا، آنکھ سے برابر دِکھائی نہیں دیتا، حاشیہ بھی اب تو مجھ سے حل نہیں ہوتا، حدیث پڑھانے کا جو حق ہے وہ بھی مجھ سے ادا نہیں ہوتا''۔اور پھر اس کے بعد ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ: ''پھر بھی جامعہ والے مجھے نبھا رہے ہیں''۔

اس موقع سے راقم کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان قیمتی گوہروں اور بیش بہا جواہر پاروں کو سنبھال سنبھال کر رکھنے میں جامعہ ہذا کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب دامت برکاتہم اور سابق مہتمم حضرت مولانا سعید صاحب بزرگؒ کا بڑا کردار رہا ہے۔

جود وسخا کا پیکر

آگے کی جو سطریں مَیں پیش کرنے جا رہا ہوں، غالباً یہ آپؒ کے اوصاف کا وہ گوشۂ خمول ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ انسان کے

دنیا سے چلے جانے کے بعد اُس کے معدن سے خزانے باہر آتے ہیں۔ بالکل ٹھیک اِسی طرح آپؒ کا یہ وصف لوگوں کے سامنے اُس وقت اُجاگر ہوا، جب آپؒ اِس دنیا سے رِحلت فرما گئے۔

آپؒ اپنی زندگی میں تادمِ حیات سخاوت کا بحرِ بے کراں بنے رہے، ہر ماہ اپنے گھر کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تنخواہ کی ایک بڑی مقدار اپنے مختلف ضرورت مند شاگردوں کو بہ طورِ ہدیہ اِرسال فرماتے تھے، نیز صرف شاگردان ہی نہیں؛ بلکہ اور بھی بہت سے ایسے حضرات ہیں جن کو آپؒ مواظبت کے ساتھ کبھی تو بہ شکلِ چندہ، اور کبھی بہ شکلِ ہبہ پیسے بھیجا کرتے تھے۔

آپؒ کے صاحب زادے حضرت مفتی خلیل صاحب مدظلہ نے ہمارے سامنے بیان کیا کہ: ’’والد صاحبؒ کی وفات کے بعد جب ’’واٹس ایپ‘‘ پر مسلسل تعزیتی خطوط اور پیغامات آئے، تب مجھے پتہ چلا کہ والد صاحب اپنی زندگی میں اپنے شاگردوں اور غیر شاگردوں کو ہر مہینہ کچھ نہ کچھ رقم بھیجا کرتے تھے۔

فرمایا کہ: ایک میسیج سے تو یہ معلوم ہوا کہ بنگال کے کسی سفیر کی ملاقات ’’کاوی‘‘ میں حضرت والد صاحبؒ سے ہوئی تھی، اُس وقت والد صاحبؒ نے اُن کو کچھ چندہ دیا تھا۔ اُن صاحب نے لکھا کہ: اُس وقت سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک آپؒ ہر سال بلا ناغہ چندہ بھیجتے رہے‘‘۔

انتقال کے بعد جب آپؒ کی مختلف تحریریں راقم الحروف کے سامنے

آئیں تو اُن میں سے اپنے ایک خادم کے نام یہ تحریر بھی تھی:

’’فلاں بھائی خادمِ جامعہ: اُن کو سو روپئے دے دیں۔

’’فلاں چچا: اُن کو سو روپئے دے دیں۔

’’اور سو روپئے آپ لے لیں۔

یوسف احمد کاوی، جامعہ ڈابھیل‘‘

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ زندگی بھر آپؒ اس طرح سخاوت کرتے رہے؛ لیکن دوسرے تو درکنار، اپنوں کو بھی اِس کا علم تک نہ ہونے دیا۔ واقعتاً حضرت الاستاذؒ میں ’’وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ حَتّٰى لَاتَعْلَمَ شِمَالُهُ مَاتُنْفِقُ يَمِينُهُ‘‘ کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے، جس سے آپؒ کے اخلاص وللّٰہیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

احسان شناسی اور شکرگزاری

آپؒ کے اندر احسان شناسی اور شکرگذاری کا وصف کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، جب بھی کوئی شخص آپؒ کا کوئی کام کر دیتا تو پھر نہ جانے شکر اور دعا کے اتنے کلمات آپؒ کی زبان سے نکلتے کہ اُن کی قطاریں بندھ جاتیں۔ ذیل کے اِیک واقعے سے اِس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہوگا:

ایک طالبِ علم– جو مولاناؒ کے کھانے لانے کی خدمت پر مامور تھا– نے راقم کو بتایا کہ: ایک دن کھانا پہنچانے میں دیر ہوگئی، جب میں گھر پہنچا تو مولاناؒ

کے پسر زادے: ابراہیم نے مجھ سے کہا کہ: مولانا کو دو تین بیماریاں ایسی ہیں کہ جس کی وجہ سے وقت پر کھانا ملنا ضروری ہے، آج دیر ہوگئی ہے؛ اس لیے مولانا سو گئے ہوں گے۔ میں رنجیدہ دل لیے ہوئے وہاں سے واپس آ گیا۔

دوسرے دن جب میں خدمت میں حاضر ہوا اور گذشتہ کل ہونے والی کوتاہی کی مولاناؒ سے معافی مانگی تو اُس پر مولاناؒ نے فرمایا کہ: ''آپ کا مجھ پر بہت بڑا اِحسان ہے کہ آپ اپنے وقت کو فارغ کر کے میری خدمت کے لیے آتے ہیں۔ رہی بات اُس کی جس کی تم معافی مانگ رہے ہو تو وہ تو میری ایک عادت اور ایک مزاج بن گیا ہے کہ میں بھوک برداشت نہیں کر سکتا ہوں؛ اس وجہ سے سو جاتا ہوں''۔ پھر اس کے بعد مولاناؒ نے مجھے اِتنی دُعاؤں سے نوازا کہ میرا سارا غم اور ساری شرمندگی یکلخت کافور ہوگئی۔

حدیث پڑھانے کی دعا

آپؒ کو جس درجہ عشقِ رسول تھا، اُس کی صحیح ادا الفاظ کے سانچے میں نہیں دیکھی جا سکتی؛ البتہ آپ جس زمانے میں متوسطات کی کتابیں پڑھاتے تھے، اُس زمانے میں آپؒ ہمیشہ یہ دعا کرتے تھے کہ: ''میری دعا ہے کہ مجھے حدیث کی کسی بھی کتاب کا درس مل جائے''۔ ایک مرتبہ خود درس میں فرمانے لگے کہ: ''میں نے حج کے سفر میں بیت اللہ (خانۂ کعبہ) کے سامنے بیٹھ کر یہ دعا مانگی ہے کہ: اے اللہ! ہمارے مہتمم صاحب کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ مجھے حدیث پڑھانے کا

موقع دیں''۔

چنانچہ قاری شبیر احمد صاحب نرولی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ آپؒ طواف کررہے تھے، دورانِ طواف بہ آوازِ بلند دعا کرنے کی آپؒ کی عادت تھی۔ ہمارے ایک ساتھی قاری ذاکر صاحب نے سوچا کہ چلو دیکھیں تو سہی! کہ مولانا کیا دعا کررہے ہیں؟ اُنھوں نے سنا کہ مولاناؒ دعا کررہے ہیں: ''اے اللہ! ہمارے مہتمم صاحب کے دل میں یہ بات ڈالنا کہ مجھے ابوداؤد شریف پڑھانے کا موقع دے، مجھے مسلم شریف پڑھانے کا موقع دے، مجھے ترمذی شریف پڑھانے کا موقع دے''۔

ظاہری بات ہے کہ جب اللہ کا کوئی لاڈلا خود اُس کے دربار میں جا کر فریاد کرتا ہے تو اللہ اپنے پیارے کی فریاد کیوں کر ٹال سکتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لاڈلے کی یہ فریاد سن لی اور- بحمدللہ- آپؒ کو حدیث کی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا۔ اور تادمِ حیات حدیث کی کتابیں پڑھاتے پڑھاتے اِس دنیا سے روانہ ہوگئے۔

جس سال بندہ عربی پنجم میں تھا، اُس سال آپؒ نے دورانِ درس ایک مرتبہ فرمایا کہ: ''الحمدللہ! میں نے ساری کتابیں پڑھالی ہیں۔ بس! اب دعا ہے کہ ''بخاری شریف'' مل جائے''۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ: ''تم بھی دعا کرو'' یہ کہہ کر آپ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کی جو پھلجھڑیاں چھوٹیں اُس کا منظر آج بھی میری

نگاہوں کے سامنے ہے۔

زندگی میں تو آپ کی یہ دعا ضرور تھی کہ ''میں بخاری شریف پڑھاؤں''؛ مگر درس میں بہت سی مرتبہ آپؒ یہ فرماتے تھے کہ: ''الحمدللہ! اللہ نے میری یہ دعا میرے دو شاگردوں کے ذریعے پوری کردی: ایک تو مفتی عباس صاحب، جو یہیں جامعہ میں بخاری شریف/ جلد ثانی پڑھا رہے ہیں، اور دوسرے میرے بڑے بیٹے: مفتی خلیل احمد، جو جامعہ نقیب الاسلام کاوی میں بخاری شریف پڑھا رہے ہیں۔

مستجاب الدعوات شخصیت

کسی بندے کا ''مستجاب الدعوات'' ہونا: یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے یہاں اس کی مقبولیت کی بیّن دلیل ہے؛ اس لیے کہ اِس پُرفتن اور پُرآشوب دور میں مشتبہ چیزوں سے اپنے دامن کو بچا کر زندگی گزارنا؛ ہرکس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ استاذِ مرحوم کو جتنا عرصہ دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا، نیز آپؒ کے خوشہ چینوں کی زبانی جو باتیں سامنے آئیں؛ اس سے یہ بات کھل کر عیاں ہو جاتی ہے آپؒ مستجاب الدعوات شخصیت کے مالک تھے، جس سے آپؒ کے صلاح وتقویٰ اور پرہیزگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اور کیوں نہ ہو؟ آپؒ نے بیت اللہ کے سامنے گڑگڑا کر بارگاہِ خداوندی میں بڑے دل سوز انداز میں دعا مانگی تھی کہ: ''اے اللہ! تو مجھے مستجاب الدعوات بنادے''۔ غالباً اِسی دعا کا نتیجہ تھا کہ آپؒ مستجاب الدعوات بنائے گئے تھے۔

ویسے تو آپؒ کے مستجاب الدعوات ہونے پر سینکڑوں ثبوت فراہم کیے جاسکتے ہیں؛لیکن-طوالت کے اندیشے سے-صرف ایک دونمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

میرے ایک رفیقِ درس: مولوی انس پگوٹھنی نے بتایا کہ: ''آپؒ کے مستجاب الدعوات ہونے کی بنا پر قرب وجوار اور دور دراز کے علاقوں سے حفظ کے اساتذہ اپنے پاس حفظ کرنے والے طلبہ کو لے کر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دعا کی درخواست کرتے۔ استاذِ محترم پہلے اُن ننھے مُنے بچوں کے سروں پر اپنا دستِ شفقت پھیرتے اور پھر اُنھیں دعاؤں سے نوازتے۔اُن ہی اساتذہ کی زبان-جب کہ آپؒ بہ قیدِ حیات تھے-اس طرح گویا ہوئی کہ جن جن بچوں کو اُن کی خدمت میں لے جایا گیا ان میں سے کچھ تو مکمل حافظِ قرآن بن گئے اور کچھ ابھی تک اس کی تکمیل میں بہ جہدِ مسلسل لگے ہوئے ہیں؛ لیکن ان میں سے کوئی ایک بچہ بھی ایسا نہیں نکلا جو حفظِ قرآن کی دولت سے محروم رہا ہو''۔

خود راقم الحروف کا اپنا ایک ذاتی تاثر یہ ہے کہ جب بندے نے جامعہ میں داخلے کے وقت عربی سوم کے لیے ''داخلہ امتحان'' دیا، تو امتحان کی مطلوبہ کتب میں سے ایک کتاب ''تیسیر المنطق'' کے پرچے کے کسی بھی سوال کا جواب صحیح نہیں لکھ سکا تھا۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ امتحانِ داخلہ کے موقع پر کسی بھی سوال کا جواب نہ دینے سے یا غلط لکھنے سے نمبرات پر زد پڑنے کا کافی امکان رہتا ہے جو

نتیجتاً محرومی کا باعث بن جاتا ہے۔

میں بہت ہی پریشان تھا کہ اب میرا کیا ہوگا؟ میں اِسی کش مکش میں اپنے ماموں کے ساتھ جامعہ کے صدر دروازے سے داخل ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے مولانا یوسف صاحبؒ تشریف لا رہے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد میرے ماموں جان نے کہا کہ: دعا کیجیے حضرت! کہ داخلہ ہوجائے۔ آپؒ نے فرمایا کہ: ''امتحان دے دیا ہے نا؟'' مَیں نے کہا: جی ہاں! امتحان دے تو دیا ہے لیکن......۔ اِس پر آپؒ نے دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ: ''کچھ نہیں! ان شاء اللہ داخلہ ہوجائے گا''۔ چنانچہ آپؒ کی دعا کی برکت سے -الحمدللہ- خلافِ توقع جامعہ نے میرا داخلہ منظور کرلیا۔

استاذِ جامعہ حضرت مفتی عرفان صاحب مالیگانوی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ: مولاناؒ کا عام معمول تھا کہ امتحان کے موقع پر مسجد میں جب ہم تپائیاں لگا کر فارغ ہوجاتے تو روزانہ آپؒ ہمیں امتحان میں آسانی وکامیابی کی دعاؤں سے نوازتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ تپائی لگا کر پیچھے کے دروازے سے بھاگ گئے۔ اُس دن ہمارا ''صَرف'' کا امتحان ہوا تو اُس میں ہم صحیح طور سے جواب نہیں دے سکے۔ اُس وقت ہمیں احساس ہوا کہ آج مولاناؒ کی دعا لیے بغیر بھاگ آئے تھے، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم امتحان میں صحیح طریقے سے بول نہیں پا رہے ہیں۔

اُس دن سے ہمارے دل میں اتنا یقین بیٹھ گیا کہ مولاناؒ کی دعا سے واقعتاً ہمارا امتحان آسان ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد روزانہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ مولاناؒ سے دعا لیے بغیر نہیں جائیں گے۔

زندگی کے آخری چند ماہِ مبارک

جیسا کہ پیچھے یہ بات آ چکی ہے کہ ابتدا میں آپ عموماً رمضان المبارک جماعت اور خانقاہ میں گزارتے تھے؛ لیکن اپنی زندگی کے آخری دس بارہ سال آپ نے اپنے محبوبین ومعتقدین کی فرمائش پر ماہِ مبارک اپنے شاگردِ رشید حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ایرانیؒ کے مدرسے (اُدگاؤں، مہاراشٹر) میں گزارے، جس کی تفصیل خود اُن کے صاحب زادے حضرت مولانا احمد اللہ ایرانی زید مجدہ (مہتمم مدرسہ اُدگاؤں، مہاراشٹر) نے اپنی ایک قلمی تحریر میں عنایت کی ہے۔ ذیل میں ان کے شکریہ کے ساتھ ہو بہو اُس کو نقل کیا جاتا ہے:

''حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کا عمر کے آخری بارہ یا تیرہ سال کے زمانے میں ''اُدگاؤں'' سے بڑا گہرا ربط رہا ہے؛ کیوں کہ حضرت مولانا یوسف صاحبؒ، مرحوم والد صاحب (مولانا اسعد اللہ صاحب ایرانیؒ) کے خاص اساتذہ میں سے تھے۔ ۲۰۰۲ء میں حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کو اس علاقے میں سب سے پہلے لانے والے حاجی عبد الغنی صاحب میرج والے ہیں۔ اُس وقت حضرتؒ کے ساتھ قاضیٔ شریعت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب اور قاری حبیب اللہ صاحب

بھی تھے۔ جس وقت حضرتؒ تشریف لارہے تھے تو والد صاحبؒ اُس وقت سفر میں تھے، جب والد صاحبؒ کو اِس کی اطلاع ملی تو فون پر بات کی کہ: حضرت میرے خاص استاذ ہیں، تم ضرور اُن کی ملاقات کے لیے جانا۔ چنانچہ میں، مولانا عبدالمجید صاحب، مولانا عبدالرحمٰن اور میرے بھائی مولانا عبدالصمد صاحب ''میرج'' ریلوے اسٹیشن پر گئے اور حضرت والاؒ سے ملاقات کی، یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ملاقات کے بعد حضرت مولانا مرحومؒ نے بہت ہی مسرت وخوشی کا اظہار فرمایا۔ دو روز کے بعد حضرت مولانا مرحومؒ ''اُدگاؤں'' مدرسہ تشریف لے آئے، اور طلبہ واساتذہ کو تقریباً پندرہ منٹ اپنے قیمتی مواعظِ حسنہ سے نوازا۔

والد صاحبؒ نے حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کا ایک واقعہ سنایا، فرمایا: میں نے درجۂ عربی اول، درجۂ عربی دوم اور درجۂ عربی سوم میں تقریباً حضرت مولانا یوسف صاحبؒ سے بائیس کتابیں پڑھی ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ نے اپنا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ: جس وقت میں عربی اول پڑھ رہا تھا تو ایک روز ''کتاب النحو'' کا سبق کچا یاد تھا، تو حضرت مولاناؒ نے برجستہ فرمایا: ''ایرانی! کل دوپہر کو تم سوئے نہیں؟'' تو والد صاحبؒ نے فرمایا: جی حضرت! سویا نہیں، میں نے انگریزی سیکھنے کے لیے انگریزی کلاس میں داخلہ لیا ہے؛ چوں کہ اُس وقت ڈابھیل میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد انگریزی کلاس کا گھنٹہ تھا۔ حضرت مولانا مرحومؒ نے ازراہِ مزاح فرمایا کہ: انگریزی زبان تو ''بیل موتے'' ہوتی ہے (یعنی راستہ پر

جب بیل پیشاب کرتے ہیں تو اُس کا نقشہ بالکل انگریزی تحریر کی طرح ہوتا ہے)
پھر حضرت مولاناؒ نے سنجیدگی سے فرمایا کہ: انگریزی پڑھنا چھوڑ دو۔ تو والد صاحبؒ نے اُسی وقت اُس درجے سے داخلہ نکال لیا۔

جب دوسری مرتبہ بہ غرضِ علاج بقرہ عید کی تعطیلات میں حضرت مولانا یوسف صاحبؒ، حاجی عبدالغنی صاحب میرج کی دعوت پر تشریف لائے، تو دو روز حاجی صاحب کے مکان پر آپؒ نے قیام فرمایا، اُس وقت حضرت مولانا یوسف صاحبؒ نے حاجی عبدالغنی صاحب سے کہا کہ: میرے شاگرد مولوی اسعد اللہ ایرانی کے یہاں مجھے جانا ہے۔ چنانچہ تیسرے روز حضرت ظہر کے وقت اُدگاؤں تشریف لے آئے۔ حضرت والد صاحبؒ نے بے انتہا خوشی کا اظہار فرمایا اور اپنے روم میں حضرتؒ کے لیے قیام کا نظم فرمایا۔ اِس سفر میں دادی اماں (حضرتؒ کی اہلیہ) بھی ساتھ تھیں۔ عصر سے قبل حضرت مولاناؒ نے حاجی عبدالغنی صاحب کو فون کیا کہ: میں یہیں رہنا چاہتا ہوں؛ کیوں کہ علمی ماحول ہے اور ہمارے مزاج سے میل کھاتا ہے۔ چنانچہ حضرتؒ نے بقیہ چھٹی یہیں ''اُدگاؤں'' میں گزاری۔ اُس کے بعد حضرتؒ دادی اماں کے ساتھ کبھی بقرہ عید کی تعطیلات، تو کبھی ششماہی کی تعطیلات، اور کبھی سالانہ کی تعطیلات مکمل یہیں گزارتے۔

جب حضرت مولاناؒ یہاں تشریف لاتے تو والد صاحبؒ حضرتؒ کے لیے ایک گاڑی، ڈرائیور اور ساتھ میں کبھی مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو، تو کبھی مولانا

عبداللہ صاحب کو آپؒ کی خدمت کے لیے متعین فرماتے۔ والد صاحبؒ کی وفات کے بعد تو تقریباً سالانہ کی مکمل تعطیلات یہیں اُدگاؤں میں گزاری، جس کی اِطلاع خود حضرتؒ نے اپنے معمول کے مطابق دو مہینے پہلے تفصیل کے ساتھ کردی تھی کہ: ہم کب آئیں گے؟ کس گاڑی سے آئیں گے؟ کس وقت پہنچیں گے؟ جب حضرت مولاناؒ ''اُدگاؤں'' تشریف لے آئے تو رمضان المبارک شروع ہونے سے قبل اپنے شاگردوں اور دوست واحباب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ مَیں نے رمضان المبارک شروع ہونے سے پہلے حضرت والاؒ سے پوچھا کہ: رمضان میں کہیں سفر کا اِرادہ ہے؟ تو حضرتؒ نے جواباً فرمایا کہ: رمضان میں ہم کہیں نہیں جائیں گے، اِس ماہ میں صرف عبادت ہی کریں گے، دوسرا کوئی کام یا سفر وغیرہ نہیں کریں گے۔ جیسے ہی رمضان المبارک شروع ہوا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ: میرے تکیے کے قریب ''بخاری شریف'' اور ''مسلم شریف'' رکھ دینا۔ رمضان المبارک میں بڑے اہتمام کے ساتھ عبادت کرتے اور اُن کتابوں کا مطالعہ کرتے، باقاعدہ فجر کے بعد ذکر بالجہر فرماتے، نیز تراویح کے بعد مزید نفلوں میں تین تین پارے ہر روز سننے کا معمول رہا ہے۔

یہاں مدرسہ ہذا میں رمضان المبارک کے آخری عشرے کے اعتکاف کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں والد صاحبؒ کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی ہے، تو میں نے حضرت مولاناؒ سے درخواست کی کہ: حضرت! آپ کا

ایک بیان اور ہر روز قبل از افطار جہری دعا ہو! تو حضرتؒ نے اِس بات پر مسکرا کر فرمایا کہ: دیکھو بھائی! مجھے خانقاہ کا ''دولہا'' نہ بناؤ۔ مگر میں نے بہت اِصرار کیا، اس پر حضرتؒ نے قبول فرمالیا۔ جب حضرتؒ دعا فرماتے تو تقریباً آدھا گھنٹہ اہتمام کے ساتھ جہری دعا فرماتے۔ اعتکاف کے آخری دن تو میرے اصرار پر پون گھنٹہ بیان فرمایا، پھر افطار فرما کر گھر تشریف لے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مرتبہ نصیب فرمائے۔ آمین

(مولانا احمد اللہ صاحب ایرانی کا مضمون پورا ہوا۔)

بابِ سوم

آخری لمحات، وفات، وصیت، تعزیتی خطوط اور خراجِ محبت وعقیدت

ایک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا

استاذِ مرحوم کی زندگی بھر کی ایک ہی تمنا تھی جس کا بار بار اپنے اسباق میں اظہار فرماتے کہ: حدیث کی خدمت کرتے کرتے ''بلاوا'' آوے۔ اِدھر کچھ مدت سے آپؒ کی صحت کو دیکھ کر چہ می گوئیاں ہو رہی تھی کہ شاید آپؒ مشغلۂ درس وتدریس چھوڑ کر گوشۂ عافیت میں جا بیٹھیں؛ لیکن خدا کو اپنے پیارے کی تمنا رد کرنا منظور نہ تھا اور کیوں کر ہو؟ جب کہ حدیث شریف میں اللہ کے اُن نیک بندوں کا تذکرہ ہے جن کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا کہ: ''إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ'' اگر وہ اللہ کے نام کی قسم کھا کر حلفیہ کوئی بات کہہ دیں تو اللہ پوری کر کے دِکھلا دے۔

ششماہی تعطیلات کے بعد سنیچر کے دن جب جامعہ کھلا تو اُس دن آپؒ پڑھانے کے لیے تشریف لائے اور ''مشکوٰۃ شریف'' کا درس دیا اور عربی ششم کے تمام طلبہ کے لیے کتب خانے سے ''الفوز الکبیر'' بھی منگوائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ: آئندہ کل سے اِس کا سبق شروع کریں گے۔ کس کو پتہ تھا کہ آئندہ کل درس گاہ آپؒ کی صورت بھی نہیں دیکھ سکے گی۔ دورانِ درس یہ اطلاع بھی دی کہ: ''گذشتہ شب دیوبند کے نائب شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمیؒ کا انتقال ہو گیا ہے''۔ کون جانتا تھا کہ جو آج کسی دوسرے کے انتقال کی خبر دے رہا ہے، کل خود اس کی خبر آنے والی ہے؟

موت کا منظر بھی بڑا پیارا ہے کہ دادی اماں کی- بیماری کی وجہ سے-عشا کی نماز باقی رہ گئی تھی؛ اس لیے وہ صبح تہجد کے وقت اُٹھیں اور وقت معلوم کرنے کے لیے بغل والے کمرے میں گئیں۔ جب واپس آئیں تو آپؒ نے دریافت فرمایا کہ: اُس کمرے میں کیوں گئی تھیں؟ تو کہا کہ: گھڑی دیکھنے کے لیے گئی تھی کہ صبح صادق میں ابھی کتنی دیر باقی ہے؟ فوراً آپؒ نے فرمایا کہ: مجھ سے پوچھ لیتی، میں تو جاگ ہی رہا تھا، میں کہاں سویا ہوا ہوں؟

اس کے بعد آپؒ قبلہ رو ہوکر لیٹ گئے یہ کہہ کر کہ: ''میری زندگی پوری ہو رہی ہے، اب میں جا رہا ہوں''۔ ابھی صبح صادق میں کچھ دیر تھی، اُس وقت تین مرتبہ آپؒ نے ''اللہ، اللہ، اللہ'' کہا۔ دادی اماں نے آپؒ سے کہا کہ: کچھ پانی لے کر آؤں آپ کے لیے؟ آپؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر دادی اماں زمزم لے کر آئیں؛ مگر آپؒ نے وہ بھی نوش نہیں فرمایا، غور سے دیکھا تو آپؒ کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہے، تکیہ تک پسینے سے بھیگا ہوا ہے اور آپؒ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

بس یہی چند گھڑیاں تھیں جن میں سکرات کی حالت رہی اور مکمل اکہتر سال کی طویل زندگی بسر کرکے ۲/ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ، مطابق: یکم جنوری ۲۰۱۷ء بہ روز یک شنبہ اِس دارِ فانی سے عالمِ جاوِدانی کی طرف کوچ کر گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

کڑے سفر کا تھکا مسافر، تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کر لیں، ہزاروں آنکھیں بھگو گیا ہے

تدفین کا ایک منظر

کیا بتاؤں اس عاشقِ نبی، عاشقِ حدیث، دائم الذکر اور دائم الفکر کے جنازے کا حال؟! جدھر دیکھو اُدھر علما اور طلبہ کا گروہ بہتے سیلاب کی طرح دیوانہ وار آپؒ کے جنازے میں شرکت کر رہا ہے، شمعِ علم کے پروانے لپک لپک کر اپنے استاذِ رحیل کے جنازے کو- قضا و قدر کے آگے سر جھکاتے ہوئے- اپنے کندھوں پر اُٹھائے آخرت کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر ایک نم دیدہ اور غم زدہ نظر آ رہا ہے، ہر کسی کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی ہے، کسی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی ہیں، تو کسی کی نگاہیں پتھرائی ہوئی ہیں۔ جامعہ کا عملۂ تدریس یتیم اولاد کی طرح بے کسی و لاچاری کے عالم میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر کسی کو یہ غم ہے کہ جن کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتے تھے، جن کے دیدار سے دل کو تسلی ہوتی تھی کہ جب تک اِن اَکابر کی شفقتوں کے سائے باقی ہیں تب تک جامعہ کو کچھ نہ ہوگا، اُن کی دعائیں، اُن کا رونا دھونا اور اُن کی دل سوزیاں جامعہ کی رونق بڑھاتی رہے گی۔ اب کہاں وہ راتوں کی آہیں اور دن کی بے قراریاں؟ اب کہاں وہ نم دیدہ آنکھیں اور قلبِ بریاں؟ ہائے! اب کون ہمیں اپنی آہِ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی میں یاد کرے گا؟ کس کو دیکھ کر اپنی

آنکھیں ٹھنڈی کریں گے؟ اب کون ہمارے زخموں پر مرہم رکھے گا؟

تھا جن کے پاس زخم کا مرہم کہاں گئے
جو دل کو جوڑتے تھے وہ معمار کیا ہوئے

بالآخر گورِ غریباں پہنچ کر- خواہی نہ خواہی - آپ کو بڑے اَدب واحترام کے ساتھ قبر میں اتارا اور "ایک حبیب کو دوسرے حبیب" سے ملا دیا۔

رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَىٰ رَحْمَةً وَاسِعَةً، وَتَغَمَّدَهُ اللّٰهُ تَعَالَىٰ بِغُفْرَانِهِ، وَأَنْزَلَ عَلَىٰ قَبْرِهِ شَآبِيبَ رَحْمَتِهِ، وَأَدْخَلَهُ فَسِيْحَ جَنَّاتِهِ، وَأَفَاضَ عَلَيْنَا بَرَكَاتِهِ، وَغَفَرَ لَهُ جَمِيعَ زَلَّاتِهِ.

بہر حال! استاذِ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑا جس کا پُر ہونا بہ ظاہر ناممکن ہے۔ جس دن آپؒ کی میت زیبِ دوش تھی اس کے ساتھ علم وفن، تاریخ وادب، سلوک ومعرفت، ریاضت وعبادت، دعوت وتحریک؛ بہت کچھ رخصت ہو گئے اور اَب صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے:

سرودے رفتہ باز آید کہ نہ آید
نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دِگر دانائے راز آید کہ نہ آید

آپؒ کی دو وصیتیں

وفاتِ حسرت آیات کے بعد جب حضرت مفتی معاذ صاحب اور حضرت مفتی اویس صاحب زید مجدہما (راقم الحروف بھی ساتھ تھا) مولاناؒ کے صاحب زادے: حضرت مفتی خلیل صاحب مدظلّہ کی خدمت میں تعزیت وملاقات کے لیے پہنچے تو مفتی اویس صاحب زید مجدہ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ: والد صاحب نے کوئی وصیت کی ہے؟ اِس پر اُنھوں نے فرمایا کہ: والد صاحب کے پاس تھا ہی کیا جو وصیت کر جاتے، جو کچھ ہے اور جتنا ہے سب میری اور آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے، بس یہیں جوڈابھیل میں معمولی اَثاثہ ہے وہی والد صاحبؒ کا کل سرمایہ ہے، نہ گاؤں میں کوئی زمین جائداد ہے، نہ کوئی بینک بیلنس ہے جو آپؒ کو وصیت کرنے کی ضرورت رہتی۔ البتہ آپؒ نے صرف ایک وصیت کی تھی اپنی قبر سے متعلق کہ مجھے یہیں ڈابھیل کے قبرستان میں مولانا حمد اللہ صاحب کے جوار میں دفن کرنا اور بس!

دو سال پہلے جس وقت جامعہ کے ایک باوقار استاذ حضرت مولانا ابراہیم صاحب کاویؒ کا انتقال ہوا، تو نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کے لیے آپؒ بھی قبرستان تشریف لے گئے۔ قبرستان میں بہت سے بڑے بڑے علمائے کرام کی قبریں موجود ہیں۔ آپؒ نے وہاں بہت سی قبریں بتائیں، کہ یہ مولانا سید عبد الغفور صاحبؒ کی قبر ہے، یہ مولانا حکیم حمد اللہ صاحبؒ کی قبر ہے۔ پھر آنے کے بعد آپؒ

نے یہ وصیت کی کہ: جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے پڑوسی حکیم حمد اللہ صاحبؒ کے پڑوس ہی میں میری قبر بنائی جائے۔

اِس وقت جو جامعہ کے باہر ''دار الاساتذہ بلڈنگ'' ہے، وہ بلڈنگ جب تیار ہوئی، تو نیچے والے مکان میں جہاں حضرت الاستاذؒ کا انتقال ہوا، اس میں حضرت مولانا یوسف صاحبؒ رہتے تھے اور پڑوس والے مکان میں- جہاں اِس وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب سیلوڈی دامت برکاتہم قیام پذیر ہیں- مولانا حکیم حمد اللہ صاحبؒ رہتے تھے۔ فرمایا کہ: ہم دونوں پڑوس میں تھے مکان کے اعتبار سے تو قبر کے اعتبار سے بھی ہم پڑوس ہی رہیں گے۔ اس لیے آپؒ نے اس جگہ اپنی قبر کی وصیت کی تھی۔

چنانچہ آپؒ کے وصال کے بعد حضرت مہتمم صاحب کے ایما پر حکیم حمد اللہ صاحبؒ کے پڑوس ہی میں آپؒ کی وصیت کے مطابق قبر بنانا تجویز ہوا۔

ڈابھیل میں دفن ہونے کی وجہ

حضرت استاذِ مرحوم ڈابھیل میں دفن ہونے کی وجہ یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ: مَیں ڈابھیل مَیں اس لیے دفن ہونا چاہتا ہوں کہ یہ صلحا کا قبرستان ہے، یہاں بڑے بڑے محدثین مدفون ہیں اور میری قبر پر طلبہ ہمیشہ آتے رہیں گے اور ایصالِ ثواب کرتے رہیں گے، یہ چیز دوسری جگہ نصیب نہیں ہو سکتی؛ اس لیے مَیں یہاں مدفون ہونا چاہتا ہوں۔

دوسری وصیت یہ فرمائی تھی کہ: ''میرے انتقال کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو سکے جامعہ کا مکان خالی کر دینا، جامعہ والوں کو مانگنے کی نوبت نہ آنے پائے''۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا، ایک ہفتے بعد اس مکان کو خالی کر دیا گیا۔ یہ مولانا کی فکر اور احتیاط کا نتیجہ تھا؛ ورنہ آج کون اس قسم کی چیزوں کا خیال کرتا ہے!!۔

آپؒ کے انتقال کے بعد شاگردوں کے مختلف خواب

آپؒ کے انتقال کے بعد آپؒ کے شاگردوں نے آپؒ سے متعلق مختلف خواب دیکھے جس سے یقیناً بارگاہِ ایزدی میں آپؒ کی مقبولیت اور سرخ رو ہونے کا -ان شاء اللہ- اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ جتنے خواب میرے سامنے آئے ترتیب وار اُن سب کو قارئین کی خدمت میں پیش کر دوں:

(۱) پہلا خواب:

جس وقت حضرتؒ کا انتقال ہوا، عین اسی وقت جامعہ کے ماضی قریب کے فاضل اور حضرت الاستاذ مرحومؒ کے خادمِ خاص مولوی حذیفہ کاوی زید مجدہ نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا۔

اُن کو پتہ نہیں تھا کہ حضرتؒ کا اِس وقت انتقال ہوا ہے، وہ خواب میں دیکھ رہے ہیں کہ حضرت الاستاذؒ بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سامنے بہت سارے طلبہ موجود ہیں۔ جو منظر جنازے کا تھا بعینہ یہ وہی منظر ہے؛ لیکن اس میں یہ ہے کہ حضرتؒ زندہ ہیں، بیدار ہیں اور مفتی خلیل صاحب (جو حضرت الاستاذؒ کے صاحب زادے

ہیں) پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں۔حضرت الاستاذؒ نے حذیفہ سے کہا کہ: دیکھو! مولوی خلیل وہاں اکیلے بیٹھے ہیں، تم اُن کے پاس ہی رہنا، اُن کے ساتھ ہی رہنا۔ وہاں کچھ طلبہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، اُن طلبہ سے کہہ رہے ہیں کہ: چائے پی کر جائیں، ایسے مت جانا۔ اتنے میں (مولوی حذیفہ کہتے ہیں کہ:) بس میری آنکھ کھل گئی۔

اٹھنے کے بعد مولوی حذیفہ نے فوراً اپنی اہلیہ سے کہا کہ: آج تو مولانا یوسف صاحب خواب میں آئے، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ اور اِس طرح کا میں نے خواب دیکھا۔ پھر فجر کی اذان کے بعد جب اُنھوں نے اپنا واٹس ایپ (**whatsapp**) دیکھا تو اس پر حضرتؒ کے انتقال کی خبر ملی۔

اِس خواب سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ واقعتاً آپؒ کی موت -ان شاء اللہ- مقبول ومغفور موت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپؒ کی علمی خدمات کو قبول فرمائے۔

(۲) دوسرا خواب:

حافظ ظہیر صاحب زید مجدہ جو جامعہ ہی میں حافظ ہوئے ہیں اور حضرت ہی سے متعلق ہیں، اُنھوں نے آپؒ کے انتقال کے تیسرے دن (منگل) دوپہر کے وقت ایک عجیب خواب دیکھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ: واٹس ایپ (**whatsapp**) کے اوپر جو حضرتؒ کے حالات چل رہے تھے، میں اُس کو پڑھتے پڑھتے سو گیا، تو خواب میں دیکھا کہ کوئی پڑھنے والا قرآن مجید کی ایک آیت سنا رہا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۝ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا۝﴾ [ترجمہ: (اللہ تبارک وتعالیٰ) وہی ہے جو خود بھی تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اُس کے فرشتے بھی؛ تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے، اور وہ مؤمنوں پر بہت مہربان ہے۔ جس دن مؤمن لوگ اللہ سے ملیں گے اُس دن اُن کا استقبال سلام سے ہوگا اور اللہ نے اُن کے لیے باعزت انعام تیار کر رکھا ہے۔ (توضیح القرآن، سورۂ احزاب: ۴۳-۴۴)] یہ آیت پڑھتے ہوئے میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ بعد میں جا کر میں نے حضرت مفتی یحییٰ صاحب مدظلہ کو اپنا یہ خواب سنایا اور اُنھوں نے اِس آیت کا ترجمہ اور پس منظر سنایا۔ بس! اب یقین ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اُن کی یہ نوازش ضرور ہوئی ہوگی۔

(۳) تیسرا خواب:

حضرت مفتی ابوبکر صاحب مدظلّہ العالی نے خود اپنا خواب بیان فرمایا کہ: مولاناؒ کے انتقال کے دو ایک دن کے بعد کی بات ہے کہ میں سویا ہوا تھا، مولاناؒ خواب میں تشریف لائے اور ہماری قدیم درس گاہ (جہاں اِس وقت قاری رضوان صاحب کی کلاس ہے) کے پاس جو زینہ ہے اُس زینے پر مولاناؒ وہی اپنی پیرانہ سالی کے انداز میں ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔

تعزیت نامے

﴿۱﴾ پیغامِ تعزیت از حضرت شیخ القراء

جامعہ کے ہال میں شعبۂ تقریر وتحریر کی طرف سے حضرتؒ کے سانحۂ ارتحال پر آپؒ کے اوصاف وکمالات، اور خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں جامعہ کے بہت سے اساتذہ نے اپنے قیمتی تأثرات پیش فرمائے؛ مگر اِس جلسے میں شیخ القرا حضرت قاری ومقری احمد اللہ صاحب بھاگلپوری دامت برکاتہم العالیہ اپنے وطن میں ہونے کی وجہ سے شریک تو نہ ہو سکے تھے؛ لیکن آپ نے اپنا ایک تعزیت نامہ حضرت قاری محمد رضوان صاحب مدظلہ کے توسط سے حاضرینِ جلسہ کے گوش گزار کروایا۔ ذیل میں اس کو نقل کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد!

معزز حاضرین! حضرت مولانا یوسف احمد صاحب کاویؒ کے اِس طرح اچانک چلے جانے کی وجہ سے دل غمگین اور دُکھی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ بے ضرر انسان تھے، مدرسہ میں ایک طویل عرصے تک بہ حیثیت اُستاذ ہم دونوں ساتھ رہے؛ لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی کوئی رنجش کی بات پیش آئی ہو۔

بندہ کی درسی خدمات میں حضرت مولاناؒ کا قابلِ ذکر تعاون رہا اور

خصوصیت سے طلبہ کو تجوید پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مدرسہ کو آپؒ کا نعم البدل عطا فرمائے اور آپؒ کی تمام تر خدمات کو قبول فرمائے، اِس موقع پر بندہ آپؒ کے پس ماندگان کو بھی تعزیتِ مسنونہ پیش کرتا ہے۔ فقط والسلام

احمد اللہ بھاگلپوری قاسمی

﴿۲﴾ از: حضرت مولانا یوسف بھولا (فاضلِ جامعہ، مقیم: امریکا)

باسمہٖ تعالیٰ

میرے مشفق داعی الی اللہ استاذ المکرم مولانا یوسف کاویؒ

"کل نفسٍ ذائقۃُ الموت" ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ واقعی موت برحق ہے، یہ اٹل فیصلہ ہے، ہر ایک کو اللہ کے پاس جانا ہے۔

زندگی دن بہ دِن برف کی طرح پگھلتی رہتی ہے اور آئے دن کوئی نہ کوئی ہم سے جُدا ہوتا ہے، پھر نعم البدل ملنا مشکل ہے۔

میرے اساتذۂ کرام کی جماعتوں میں سے ایک تابندہ ستارہ، علم وعمل، زہد وقناعت کے پیکر داعی اِلی اللہ میرے مشفق استاذ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سوائے دعاؤں اور صبر کے میرے پاس کچھ لکھنے کو نہیں ہے۔

جامعہ ڈابھیل میں حضرت سے عربی دوم وسوم کی چند کتابوں کے پڑھنے کا شرف بندہ کو حاصل ہوا۔ بہت ہی آسان انداز میں کما حقہ کتابوں کو پڑھاتے تھے۔ میرے مشفق استاذ وقت کے بہت پابند تھے، گھنٹی بجنے سے پہلے درس گاہ

میں حاضر رہتے تھے۔ اگر گھنٹی بجنے کے بعد کوئی طالبِ علم آتا تو فوراً کہتے تھے: آپ دیر سے پہنچے۔ میرے ایک ساتھی کو کہا: آپ ڈھائی سکنڈ دیر سے پہنچے۔ یہ جملہ ابھی تک مجھے یاد ہے۔

اگر کوئی طالبِ علم سبق میں اعتراض کرتا تھا، تو فرماتے تھے کہ: اس کے تین جواب ہیں: (۱) صبر نہیں۔ (۲) مطالعہ نہیں۔ (۳) آگے آرہا ہے۔

امتحان گاہ میں نگرانی بھی کرتے تھے اور فرماتے تھے: عربی دوم والے عبارتوں کو عبارتوں سے ملالو۔

بہت ہی سادہ طبیعت کے تھے، کوئی چالاکی نہیں تھی، ہمیشہ ہم جیسے طالبِ علموں سے بھی سادگی سے بات کرتے تھے۔ دعوت اِلی اللہ کے کام کی سرپرستی کرتے تھے، خود بھی نظام الدین جا کر چلہ لگاتے تھے۔ میرے ایک سفر میں استاذِ مکرم؛ حضرت نظام الدین وقت لگانے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ڈابھیل اور اس کے اطراف کی کارگزاری سنائی، مجھے بہت ہی خوشی ہوئی اور اچھا سبق ملا کہ میرے ایک استاذ خود بھی وقت لگانے آئے اور نیچے زمین پر آرام کرتے ہیں اور امت کی فکر کرتے ہیں۔

استاذِ مکرم کی ساری زندگی مجاہدہ فی الدین میں گذری، دنیوی اَغراض سے کوسوں دور تھے، چلتے تھے تب بھی نگاہ نیچی رہتی تھی۔

میرے سارے اساتذۂ کرام کی ابتدائی حالات اگر میں لکھوں تو ایک

کتاب درکار ہے۔ قلیل تنخواہ، عائلاتی ذمہ داریاں اور استغناعن الناس واقعی قابلِ رشک ہے۔ اب تو چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو بہت کم لوگ ملیں گے۔

بارہا اسباق میں کہتے تھے: مسبوق ہونے کا شرف حاصل نہ کرو؛ بلکہ تکبیرِ اولیٰ کا اہتمام کرو۔ تربیت کا خاص انداز درس میں ہوتا تھا۔ جو طالبِ علم محنت سے پڑھتا تھا اس کی بہت ہی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

جب بھی امریکا سے میں آتا تھا، حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں پہنچتا تھا۔ بہت خوش ہوتے تھے، یہاں کی امت کا حال اور دعوت کے کام کی کارگزاری سنتے تھے اور مجھے کہتے تھے: جامعہ میں طلبہ کو عصر کے بعد (یہ ساری کارگزاریاں) بتاؤ۔ بہت ہی دعا دیتے تھے۔ ہدیہ میں عطر دیتے تھے۔

الحمدللہ! میرے سارے اساتذہ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ کوئی کنایہ اور اشارہ سے مال کا مطالبہ نہیں کیا، نہ کوئی طمع کی۔ پھر بھی الحمدللہ! حسبِ استطاعت بندے نے سارے اساتذہ کا خیال رکھا۔ یہ میرے لیے سعادت ہے۔

امید ہے کہ ان کی دعا اور ان کی شاگردی کا شرف مجھ جیسے ناچیز کے لیے آخرت میں ذریعۂ نجات بنے گا ان شاء اللہ۔

اساتذہ میں اب تو مرشدی ومولائی حضرت اقدس مفتی احمد خانپوری دامت برکاتہم، مفتی احمد دیولوی دامت برکاتہم، مفتی اسماعیل کچھولوی دامت برکاتہم، اور استاذ الاساتذہ قاری ومقری احمد اللہ قاسمی دامت برکاتہم اور مولوی

یعقوب بھولا کفلیتوی۔ اور انگلش کلاس کے حافظ عبد الرحمٰن میمی بار باڈوسی اور ماسٹر مختار باقی ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائیں اور عافیت کے ساتھ طویل عمر دیں۔ آمین

گنہگار: یوسف احمد بھولا
عرف ’’جامعہ ڈابھیل‘‘
امام مسجد اسٹاکٹن، کیلیفورنیا (امریکا)

﴿۳﴾ از: حضرت مولانا محمد دھورات صاحب مدظلہ

برادرِ محترم مولوی رشید بن حضرت مولانا یوسف کاوی صاحبؒ!

کل بعدِ نمازِ عصر مولانا عبد اللہ دیولوی نے بالمشافہہ اور حاجی عثمان پٹیل نے بہ ذریعۂ فون یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ قبلہ والد صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان اِس دارِ فانی کو چھوڑ کر دارِ بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مشکوٰۃ اور مسلم شریف کے اِس مسلّم استاذ کی خبرِ وفات حسرت آیات سن کر ہم جیسے کتنے دل صدمے سے چور ہوں گے اور دعائے رحمت ومغفرت اور ایصالِ ثواب میں لگ گئے ہوں گے ؎

وہ مرتے نہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ! موت کو کس نے مسیحا کر دیا

أعظم الله أجركم وأحسن عزاءكم وغفر لميتكم.

دعا ہے: ’’اللّٰھُمَّ اغفر له وارحمه واعف عنه واجعله من عبادك المنتخبين الغر المحجلين والوفد المتقبلين اللّٰھُمَّ اکرم نزله ووسع مدخله واجعل قبره روضة من رياض الجنة.‘‘

ہم حضرت شیخ زکریا قدس سرہ کے متوسّلین میں شریک تھے، مدرسہ مفتاح العلوم تراج میں مجھ سے بہت پہلے پڑھا چکے تھے، پھر صلاحیت اور مقبولیت نے جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل پہنچایا، وہیں رہے، فیض پہنچایا اور رحمت کا بلاوا آیا تو جان جاں آفریں کے حوالے کر دی۔

واقعی اہلِ خانہ واعزہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، وہی خالق مالک جو مقدر ومدبر ہے، سب کی اشک شوئی کرے اور صبر وہمت سے تسلی وتشفی بخشے۔

مرحوم علم وعمل اور تدریس کے ساتھ ذاکر شاغل تھے، اُن کی خاموش پُرسکون طبیعت، وضع قطع اور حلیہ نظروں کے سامنے پھر رہا ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

کہنے والے نے سچ کہا ہے:

موت اس کی ہے جس کا کرے زمانہ افسوس
ورنہ یوں تو سبھی آئے دنیا میں مرنے ہی کے لیے

شریکِ غم، دعا گو ومحتاجِ دعا: محمد دھورات

تیرے غم میں ہر ایک سوگوار ہے

استاذِ مرحوم کی وفاتِ حسرت آیات پر صرف متعلقین ومنتسبین ہی مغموم نہیں ہوئے؛ بلکہ ملک وبیرونِ ملک کا ہر ذرہ لرز اُٹھا، یہی وجہ ہے کہ آپؒ کے انتقال کی گونج ہندوستان کے مشہور ومعروف دینی (عربی واردو) رسائل وجرائد میں بھی رہی۔

چنانچہ ہندوستان کے بہت ہی مشہور ادارے: ''جامعہ اشاعت العلوم، اکل کوا'' سے نکلنے والے ''النور'' (عربی) ماہنامے میں استاذِ محترمؒ کی خبرِ وفات کو اِن الفاظ میں شائع کیا گیا:

''تلقَّتْ أُسرةُ جامعة إشاعة العلوم الإسلامية أَكل كوا وعلى رأسها سماحة خادم الكتاب والسنة الشيخ غلام محمد وستانوي -رئيس الجامعة- والمدير التنفيذي للجامعة: الشيخ حذيفة غلام محمد الوستانوي نبأَ وفاة عالم جليل، ومحدث كبير، من جامعة تعليم الدين دابهيل غجرات: فضيلة الشيخ محمد يوسف الكاوي رحمه الله رحمة واسعة. كان الفقيه رحمه الله أُستاذا جليلًا، ومدرسًا وقورًا في ناحية، كانَ يدرس الحديث النبوي الشريف في غاية من التضرع والابتهال في ناحية.................. إلى آخره.

[النور، المجلد ٢٨ / العدد: ١٠٦ / محرم الحرام - ربيع الأول ١٤٣٨ھ]

اسی طریقے سے ہندوستان کے نہایت ہی شہرت یافتہ ماہنامہ ''ندائے

شاہی'' فروری ۲۰۱۷ء کے شمارے میں بھی استاذِ مرحوم کی وفات کی خبر مندرجۂ ذیل الفاظ میں شائع کی گئی:

''جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کے ہر دل عزیز و باوقار اُستاذ حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کا ۲؍ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ مطابق یکم جنوری ۲۰۱۷ء بروز اتوار، صبح تہجد کے وقت انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف بڑے جفاکش، نام ونمود سے دور اور تعلیم وتدریس میں اپنے کو فنا کر دینے والی شخصیات میں شامل تھے۔ ایک طویل عرصہ تک گجرات کے مرکزی مدرسہ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل سے وابستہ رہ کر ہزارہا تشنگانِ علومِ نبوت کو سیراب فرمایا اور آپ کا علمی فیض دور دور تک پھیلا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے درجات بے حد بلند فرمائیں اور دینی خدمات کا بہتر صلہ عطا فرمائیں، آمین۔'' انتھی

اِسی طریقے سے مالیگاؤں سے شائع ہونے والا رسالہ ''نویدِ شمس'' کا پورا شمارہ استاذِ محترم کی خدمات کے لیے مختص تھا، مختلف مضمون نگاروں نے استاذِ مرحوم کی حیات کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے مختلف خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ''نویدِ شمس'' کے خصوصی شمارے کا اداریہ ہدیۂ قارئین ہے:

یوسف سادِل رُبا۔ معیار سادگی، علم کا چشمہ

ایسا کہاں سے لائیں تجھ سا کہیں جسے

جامعہ ڈابھیل کی گدڑی میں بیسیوں لعل چھپے ہوئے ہیں۔ عام آدمی کی

رسائی تو اس علوم ومعرفت کے خزانے تک کیا ہوتی ، بعض طلبائے جامعہ بھی تشنہ کام ہی رہ جاتے ہیں، آج کے دور میں جب کہ اخلاص وگوشہ نشینی کو بزدلی اور شہرت پسندی وخودنمائی کی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا کمال سمجھا جاتا ہو، ایسے میں ان انسانوں کی بھیڑ میں چھپے ہوئے ملت کی تقدیر کے ستاروں کی بڑی قدر معلوم ہوتی ہے۔ ان ہی لالہ وگل ہائے جامعہ میں سے ایک عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیت ''حضرت مولانا یوسف بن احمد کاوی'' کی بھی تھی۔ موصوف نے بچپن سے بڑھاپے تک کا پورا زمانہ ڈابھیل کی فضاؤں میں گزارا۔ حیات سے ممات تک کے تمام لمحات ان ہی نورانی فضاؤں میں بسر کیے۔ جسمانی پرداخت سے کمالِ علمی وروحانی تک کا سفر ڈابھیل میں پورا ہوا۔ آپ جامعہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی آخری علمی یادگار تھے۔ حضرت جی مولانا یوسف کاندھلویؒ کے روحانی فیض یافتہ تھے۔ درس وتدریس میں پہلی سیڑھی سے ابتدا کی اور معراجِ مسلم شریف تک پہنچے۔ حدیث شریف اور دیگر علوم وفنون کی کتابوں کی تعلیم وتدریس سے حد درجہ عشق تھا۔ جس طرح محبِّ صادق محبوب کی آنکھوں میں ڈوب جانے کو چاہتا ہے، اسی طرح کتابوں میں ڈوب کر پڑھاتے تھے۔ سبق کے اوقات میں تخلّف گوارا نہ تھا، تقویٰ وعبادت میں چست وپابند کہ بڑے بڑے عبّاد وزہّاد رشک وحیرت میں ڈوب جائیں۔ بچپن میں وبائی امراض کی وجہ سے چیچک کا داغ بالکل نمایاں تھا؛ لیکن چہرہ انوارات سے تمتماتا تھا۔

شفقت وشرافت کا یہ حال تھا کہ طلبا اور شاگردوں سے ''تم'' اور ''آپ'' کہتے تھے۔ انتہائے غضب کی علامت ''تو'' تھی۔ اکابر کی یادگار خود بھی تھے اور اکابر واسلاف کو یاد بھی خوب کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ کہا کرتے تھے، اب خود بھولی اور بسری یاد ہو گئے۔ اے کاش! ہم نے قدردانی کی ہوتی تو بے مائیگی کے ساتھ بچھڑنے کا یوں افسوس نہ ہوتا۔

آسماں ان کی لحد پر گہر باری کرے
حشر تک شانِ کریمی ناز برداری کرے

[ہفت روزہ ''نویدِ شمس'' مالیگاؤں، جلد نمبر: ۸، شمارہ نمبر: ۳۴، ۷/ربیع الاول ۱۴۳۸ھ بمطابق ۶/جنوری ۲۰۱۷ء بروز جمعہ]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے رسائل میں آپؒ کے انتقال کی خبر شائع ہوئی ہے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء!

محبت وعقیدت کا خراج

حضرت الاستاذ کی وفات پر جہاں بہت سے قلم کاروں نے اپنی نثری صلاحیتوں کے جوہر دِکھائے وہیں بہت سے اللہ کے باصلاحیت بندوں نے نظم میں بھی مولاناؒ کی مدح وثناخوانی کی۔ چنانچہ ذیل میں چند مرثیے پیش کیے جارہے ہیں:

مرثیہ (۱)

نتیجۂ فکر: معاذ کولہاپوری (درجۂ عربی چہارم)

ہوا ہے جانبِ گلشن رخِ ابرِ ستم پھر سے
کسی گل کا گلستاں میں ہوا ہے سر قلم پھر سے

مسرورِ دہر نے آنسو نہ پونچھے تھے ابھی کل کے
کسی کے ہجر نے مژگاں کو کر ڈالا ہے نم پھر سے

اگرچہ برق اَفگن ہے؛ مگر ہے تو حقیقت ہی
اَجل نے میرے گلشن میں بھی رکھا ہے قدم پھر سے

وہ جن کے دم پہ اہلِ جامعہ کو ناز تھا اور ہے
اُنھیں میں سے روانہ ہے کوئی ملکِ عدم پھر سے

"سلیم" اِس بزم سے اُٹھے، ابھی غم اُن کا باقی تھا
کہ گھر آیا ہے اتنے میں سحابِ پُر اَلَم پھر سے

بڑی شدت سے آنسو روک کر چہرے اُٹھائے تھے
قضا نے پھر رُلایا تو ہوا ہر سر ہے خم پھر سے

کرایا تھا وضو کل آنسوؤں نے اہلِ محفل کو
ہیں شاید غسل ہی دینے کو آئے اشکِ غم پھر سے

بڑا ارمان تھا اُن سے تلمّذ کا میرے دل میں
ہوئی مدفون دل ہی میں تمنائے دِلَم پھر سے
لہو آشام ہیں دل بھی، جگر بھی خون میں تر ہیں
کہاں پائیں گے ہم وہ دِل رُبا دِل برِشیم پھر سے
دُعا ہے رب کہے رضوان سے ''یوسف'' کی آمد پر
مرا اک اور یار آیا، سجا دارِ نِعم پھر سے

مرثیہ (۲)

از: عمر اورنگ آبادی (شعبۂ تخصص فی الافتاء)

مرحبا صد مرحبا! اے شیر دل مردِ تواں
پیکرِ رشد و ہدیٰ ناموسِ دیں کا پاسباں
صاحبِ فکر و نظر گنجینۂ علم و ہنر
اے کہ تو زینت دہِ میخانۂ دانشوراں
یعنی حضرت شیخ یوسف احمد کاوی ہے تو
تجھ سے جاری ہے فیوضِ ''شیخ'' کا سیلِ رواں
در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
تو روایاتِ سلف کا ہے درخشندہ نشاں
تیرا ہر نقشِ عمل تابندہ تر پائندہ تر
گامزن ہے تو بہ شہراہِ حیاتِ جاوداں

ہوگئی ہے گُل اچانک مشعلِ رہ راہ سے
اُف! یہ غفلت کوشیاں، مدہوشیاں، بربادیاں
اب زمانہ نے ہے سمجھا موتِ عالم کیا ہے شئی
پیکرِ حق وصداقت چل بسا اِک مہرباں
زکریا، مسعود، سعید، مفتی خلیل اور ہے رشید
دل گرفتہ ہیں یہ پانچوں ساتھ میں عبد الرحمٰن
سوگوار اپنے پرائے سب ہیں اور غمناک بھی
ہوں معلم یا ہوں طلبہ غم میں سب ہیں بے کراں
کیا گذرتی ہے دیوانوں کے دلوں پر آپ کے
جامعہ کے ہیں در و دیوار بھی ماتم کناں
اومسیحائے زماں! تو میٹھی نیند اب سوگیا
کون اٹھائے گا بتا تو ہی یہ اب بارِ گراں
اب قیادت میں نجابت میں شرافت میں امیں
کون ہوگا سلف کا اور کون میرِ کارواں
سر ابھاریں گے نئے فتنے یہاں پر جب کبھی
بار گاہِ ایزدی میں کون ہوگا ترجماں
ساری ملت اس کے غم میں کیوں نہ ہو غم خوردہ

ان کے جانے سے ہوا یہ سُونا سُونا سائباں
جو تھے اِک شاہِ خطابت راسخ و راشد مزاج
نرم دل شیریں سخن جاتا رہا شیریں بیاں
عابد و زاہد، مجاہد، متقی و مقتدی
ہر گھڑی ہر پل جو ذکرِ رب میں تھا رطب اللّساں
منتشر حالات میں بھی جو رہا ثابت قدم
ایسا منصف ایسا مصلح چل بسا اِک پاسباں
جس کی پیشانی پہ سجدوں کے نشاں کا نور تھا
اب رسول اللہ کا جاتا رہا وہ ذکر کناں
وہ رفیع الشان مدبر اور مفکر اور شجاع
قوم کو دے کر عمرؔ جاتا رہا اشکِ رواں
حق نے بخشے تھے کئی جن کو صفاتِ عالیہ
اے اجل! تو نے ہے چھینی نعمتِ احساں کناں
یاخدا! لائے کہاں سے ایسا رہبر رہنما؟
آنکھ نم ہے اور جاری ذکرِ یوسف بر زباں
آخرش کردم خدایا! بادل وجاں ایں دعا
دِہ خدا مارا تو مثلِ او شفیق و مہرباں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ومضة من ومضات حياةِ الشيخ يوسف أحمد الكاوي رحمه اللّٰه تعالى

بِيَرَاعَةِ الْعَبْدِ الضَّعِيفِ: محمد أُسامة بن مظهر الجاركندي

المتعلم في الصف السابع العربي

كُتِبَ هٰذَا الْمَقَالُ لِلْمُسَاهَمَةِ فِي الْمُسَابَقَةِبقَةِ الْكِتَابِيَّةِ السَّنَوِيَّةِ الْمُنْعَقِدَةِ مِنَ "النادي الْعَرَبِيِّ" بِجَامِعَةِ دَابيل، عَامَ ١٤٣٨هـ.

وَقَدْ فَارَقَ النَّاسُ الأَحِبَّةَ قَبْلَنَا   وَأَعْيَى دَوَاءُ الْمَوْتِ كُلَّ طَبِيب
سُبِقْنَا إِلَى الدُّنْيَا فَلَوْ عَاشَ أَهْلُهَا   مُنِعْنَا بِهَا مِنْ جَيْئَةٍ وَذُهُوْب

بَيْنَمَا كَادَتْ أَنْ تَطْلُعَ عَلَيْنَا شَمْسُ عَامٍ جَدِيدٍ، إِذْ غَرَبَتْ قُبَيْلَ طُلُوعِهَا شَمْسٌ لَّنَا فِي عَالَمِ الْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَةِ، وَاعتَرَتْ بَعْدَ انْشِقَاقِ الْفَجْرِ الصادقِ على كل مُحَيَّا مِنْ آهالي أُسرة "الجامعة الإسلامية تعليم الدين بدابيل" بوادِرُ الشجو والأَسٰى؛ بما نزلَ عليهم نَعْيُ وفاة "الشيخ يوسف أَحمد" الكاوي (رحمه الله رحمة واسعة) نزولَ الصاعقة، وحينما أَنا أُسجِّل هذه السطور إِنَّ قَلْبِي يمتلأ بِمَشَاعرَ أَليمةٍ، وعواطفَ كئيبةٍ؛ فَإِنِّي من السعداء الذين تشرَّفوا بالتلمذ على الأُستاذ الرحيل، واستقوا من نَبْعِه الفيَّاضِ، وذاقوا حلاوةَ الإِيمانِ والعلمِ والعرفانِ

من هذا الْمَنْهَلِ الْعَذْبِ الزُّلالِ.

مَوْلِدُهُ وَوَطَنُهُ

تقع فِي مضافات "بروص" بولاية "غجرات" قريةٌ تاريخيةٌ، تكُونُ مَعْمُوْرةً على سِيْفِ البحر، تُسمَّى بـ"كاوي"، التي كَانَتْ في زمن من الأَزمان على مُستوَى الازدهارِ والرقي في عَالَمِ التجارة والمعيشة؛ لكونها مِيناء. هٰذَا مِن ناحِيةٍ، وَمِنْ ناحيةٍ أُخرى إذا أَلقَينا النظرَ على تاريخِها نظرةً غَائرةً، وجَدْناهَا قد أَنْجَبَتْ من بطنِهَا علماء وصلحاء. فمِن جماعةِ علمائِها وصلحائها: أُستاذ الأَساتذة فضيلة الشيخ يوسف بن أَحمد الكاوي -رحمه الله تعالىٰ رحمةً واسعةً- الذي وُلِدَ في هذه القرية المباركة في يومِ الخميس ٩/ جمادى الثانية عامَ ١٣٦٦هـ.

إِن أُسرة الشيخ يوسف أَحمد الكاوي -نوَّر الله مرقدَه- فى بدايةِ أَمرِهَا كانت مُتْرِفَةً ناعِمَةَ الْبالِ، بِحَيْث يجري نظامُها المعيشيُّ بحسنٍ لاتعوزها النفقةُ؛ مِن مَوردِ حانوتٍ صغيرٍ كان لوالده: الحاج أَحمد؛ ولكن بعد مرور الأَيام تقَلَّبَتْ بِها الأَحوالُ، وركِبَتْ على والده دُيونٌ كثيرةٌ، حَتى أَلجأَته تلك الديونُ إلى بيع دُكانه، فباعَه والدُه على مطالبةٍ من قِبَل الدائنين، وَقَضى بثمنِه ديونَه كلَّها. وَبهذا ارتاحَ الحاج أَحمد مِن هَمِّ الدَّين؛ ولكن أَدى ذلك إلى الفقر الشديد واللَّأْواءِ؛ حتى بلغَ به الحالُ إلى أَنه لم يجد لِنفْسِه وَأَهله ما يُشْبِعُهُم.

نَشْأَتُهُ الْعِلْمِيَّةُ

في هذه الأَوضاع العَسيرة بَدأَ الأُستاذ -رحمه الله- يتلقى مبادئَ العلوم والدراسة الابتدائية في أَرضِ وطنه، فتعلَّم هُناك القرآنَ الكريم كاملا والكتب الأُردية التي تُلَقِّنُ الصبيانَ الأُمورَ الأَساسية من علم الشريعة مثلَ: اردو دينيات، تعليم الاسلام، دینی تعلیم کا رساله (الأَجزاء الإِحدىٰ عشرة) وما إِلى ذلك. كَمَا تَعَلَّمَ العلومَ العصريةَ إِلى الصف السابع مع العلومِ الشرعية على دأْب ولاية غجرات.

وَبعد زَمَنٍ حِينَما رأَى عمُّه الأَكبر: الشيخ إِبراهيم الكاوي -رحمه الله- قُدُرَاته تتزايد وتعلو، أَصْحَبَه إِلى مدرسة دارالعلوم كنتارية (حيث درَّس الشيخُ إِبراهيم منذ اليومِ الأَول من بنائها)، فمكثَ الشيخُ يوسف هُناكَ عدةَ أَيام، وَخِلَالَ إِقامته تَعلَّمَ بعضَ العلوم الدينية وتربَّى على يد عَمِّهِ المذكور.

قد قدَّمنا أَن والدَ شَيخِنا صَارَ مُعوِزًا ومُفْتَقِرًا ولا يجدُ أَيَّ وظيفةٍ، فالشيخ إِبراهيم الكاوي المذكور -رحمه الله (عمُّ شيخِنا يوسف)- التمسَ من مدير الجامعة الإِسلامية تعليم الدين بدابيل حِينئِذٍ: فضيلةِ الشيخ مولانا محمد سعيد البزرغ -رحمه الله- (والد مدير الجامعة حاليا) أَن يتَكَرَّمَ بقَبولِه مُوَظَّفًا في قِسْمٍ من الأَقسام التي تتعلق بنظام الجامعة. فقبِل الشيخ سعيد أَحمد البزرغ -رحمه الله-

هذا الالتماسَ، وعَيَّنه لِخِدْمَةِ نظامِ المطبخ بالجامعة. وبهذا انتقل والده الحاج أَحمد مع أَهله وعياله من وطنه المألوف: كاوي إِلى قرية دابيل -التي عُين في جامعتها للخدمة- وخَدمَ فيها أَربعَ سنواتٍ، فَقَامَ بأُمور المطبخ أَحسنَ قيام.

الاِنْتِسَابُ إِلىٰ جَامِعَةِ دَابِيل

بعد ما انتقل الأُستاذ -رحمه الله- مع والده وأُسرته إِلى قرية دابيل، التحق بالجامعة الإِسلامية تعليم الدين بدابيل -وهي في ذلك العصر موئلُ العلماء ومنهل الطلاب ومهوى أَفئدة طلاب العلم من أَقطار العالم- فَبَدَأَ منها مَسِيرَهُ العِلْمِيَّ بعد ما تلقى مبادئَ العلوم الدينية والدراسة الابتدائية الإِسلامية في أَرضِ وطَنه، وصَارَ يتربَّى في أَحضان العلوم والمعارف، حتى تعلَّم بِها إِلى الصف الثالث العربي متلمِّذًا على كبار الأَساتذة الْمَهَرَةِ.

ثمَّ ارتحلَ عامَ أَرْبَعةٍ وستين وتسعِ مِئَةٍ وأَلْفٍ (١٩٦٤) من الميلادِ لازدياد مواهِبِه وإِبرادِ غُلَّتِه العلميةِ الشديدةِ المتزايدةِ إِلى جامعةٍ عريقةٍ، سقاها مثلُ المحدث الجليل الشيخ خليل أَحمد السهارنفوري والشيخ أَسعد الله الرامفوري وغيرُهما من جبال العلوم والفنون: "مظاهر علوم" بمدينة سهارنفور، فجَثَا ركبتيه أَمامَ كِبَارِ المشايخِ الأَفذاذ، واستفادَ من النُّبَغَاءِ والعَبَاقِرَةِ. ومازال ساعيًا في أَعطافِ

العلم منذ نعومة أَظفاره؛ بل رُضِع بلِبانِ الاجتهادِ في العلوم والمعارف؛ حتى استقبل -بِفضل ربه- يوما كان أَسعد أَيام حياته، يومَ صارَ عالِمًا ربَّانِيًّا، مُتَضَلِّعًا عبقريًّا بعد ما تدرَّس هُناك ما بقي من الكتب الدراسية، وَتَخَرَّجَ منها سنةَ سبع وثمانين وثلاث مئة وأَلفٍ (١٣٨٧) بعد الهجرة حاصلًا على شهادة الفضيلة في علوم الشريعة الإسلامية.

التَّكْمِيْلُ الْبَاطِنِيُّ وَالتَّطْوِيْرُ الرُّوْحَانِيُّ

حينما غادرَ إلى مظاهر علوم بسهارنفور، فَبِجَانِبِ تنويرِ القلب من معرفة العلوم الشرعية الظاهرة، خاضَ في معترك التصوف لِمَزيدٍ مِنَ التطوير الروحاني وإِلهاب جذوة حُبِّ الله ورسولِه الكريم ﷺ، مقتفِيًا إِثرَ مشايخنا الديوبنديين؛ فبايعَ أَوَّلًا على يد ريحانة الهند، ومُحَدِّثِ العصر: الشيخ محمد زكريا الكاندهلوي -رحمه الله-، ولَمْ يُرِدْ بالبيعةِ عَلى يده الالتِحَاقَ بِسلسلَةِ المشايخ وحُصُولِ البرَكَةِ فحَسْبُ؛ بل كان يواظب على الحضور بين يدي شيخه كلَّ سنة بِمرافقة فضيلة الشيخ المفتي أَحمد الخانفوري (حفظه الله)، ودَاوَمَا على هذه مادام قيامُ الشيخ محمد زكريا في سهارنفور، وبعد ارتحاله إِلى ذمة الله تعالى ارتبطَ علاقته لتهذيبِ نفسِه وتزكِيتِها مع فقيه الأُمة محمود حسن الغنغوهي -رحمه الله- وعَقْبَ رحلتِه إِلى رحمة الله سلَّمَ نفسَه إلى أَميرِ هيئةِ الدعوة والتبليغ الشيخ إِنعام الحسن الكاندهلوي رحمه الله، وإِثرَ وفاته

بايَع على يد الشيخ سليمان الموغلية النقشبندي -رحمه الله (المتوطن ريونين)- بالهاتف المحمول، ولَمْ يزَلْ في بيعته إلى أن لَقِي ربَّه.

خَدَمَاتُهُ الْعِلْمِيَّةُ وَالتَّدْرِيْسِيَّةُ

بعد ماتخرَّج مُتَزَوِّدًا بزاد العلوم والتقىٰ، وضع قدمَه في مجال التدريس، فعُيِّنَ أُستاذا أَولًا في دار العلوم الواقعة بِقَرية "تارافور"، ودَرَّس هناك سنةً وَاحِدةً. وبعد ذلك انتقل أُستاذًا إلى مفتاح العلوم الواقعة بقرية "تراج" حيثُ أَلقى الدروس فيها سنتين كاملتين.

ثمَّ دَعاهُ أَربابُ جامعة دابيل، فَلَبَّى دعوتهم بِصدق فُؤادِه؛ وَكيفَ؟ وهي مدرستُه الأُم، ترعرع وتربّى في فضائها وبيئتها، وحبُّها في سوداءِ قلبِه. فَقَدِم على دعوتهم لِتَصْعِيدِ الْحَرَكة التدريسية، فضربَ الأُستاذُ الرحيلُ كشحًا عن كل شيءٍ إلى التدبر في القرآن الكريم وفيما لابُدَّ لطالب القرآن والحديث من النحو والصرف والمنطق والبلاغة والتفسير والحديث وغيرها من العلوم العقلية والنقلية؛ حتى صار شهابا في كلٍّ من المجالات، وكانت له يَدٌ بيضَاءُ وخُبرةٌ وافيةٌ فيها؛ ولاسيما كان دودةَ كتبِ علمِ الحديث والتفسير؛ لأَجل ذلك كان يحل عُقَدَ النصوصِ المغلقة بفطانته اللماعة وقَدَمِه الراسخةِ وذكائِه الباهرِ، وكان لايكتفي بدراسة ظواهر الأُمور؛ بل يذهب إلى أَعماقِ أَغوارها؛ حتى اشتهرت دروسُه بغزارة علمِه وحسنِ تدريسه وتبحُّرِ

كلامِه، وكان لا يدَّخِرُ أيَّ وُسْعٍ في مجال تفهيم الكتب؛ بل يبذل جميعَ ما في طاقتِه من الجهود الجبارة بعرق جبينه في تنقيح منهج درسه وتهذيب أُسلوبه وتنقية طِرازه. وكان الشيخ ما اهتم بِمَلْإِ جيوب الطلاب بلآلي العلوم حسبُ، بل كَانَ يهتم بتربيتهم وتزكية قلوبهم، لِذا كان يُولي الطلابَ من النصح والإِرشادِ ما هو أَولى بهم. (كما سأَذكرُ -إِنْ شَاءَ اللهُ- بعض ما أَسدى الأُستاذ إِلينا خلالَ الدرس من النصائح الغالية).

المُوَاظَبَةُ عَلَى حُضُوْرِ الْفَصْلِ وَذِكْرُ حُبِّهِ لِلطِّيْبِ

وكان الشيخ -رحمه الله- مواظبًا على الأَوقات مُواظبةً تامةً في أَمرِه كُلِّه، خصوصًا حضور الفصل على وقت محدد، فإِذا دخل الفصلَ، دخلَ يمشى مُتمايِلًا في مِشْيَتِه، ثم يجلس على كرسيه (وكان في آخر عمره يجلسُ على الكرسي ويُلقي الدروسَ لِعُسْرٍ في الجُلُوسِ على الأَرض)، ولا يذهب عليكَ أَنه يُعْجِبُه الْعِطْرُ والطيبُ؛ فلذا كان الطلابُ يضعون له العطوراتِ المتنوعةَ على المنضدةِ، فإِذا جلس على الكرسي، يتطيب بشَيءٍ مِن كل قَارورةٍ من طيبٍ يُوضَع له على أَسلوبٍ تَلْتَذُّ بِرُؤْيَتِه الأَنظَارُ، ثم يجري فيضانُه العلميُّ ويُنَوِّرُ ويُعطِّر قلوبَ ضُيوف الرسول ﷺ بنُورِ الأَحاديث والحِكَم.

والجديرُ بالذكر أَنَ الأُستاذ لا يَبْدَأُ فِي الدرسِ؛ حتى يدعُوَ بِدَعواتٍ ويُصَلِّي على النَّبِيِّ ﷺ، يهتم بها وَيُواظِبُ عليها فلاتفوته

أَبَدًا. فَنُقدِّمُ إليكَ فِيما يلي بَعضَ تلكَ الأَدعيةِ:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُونَ، وَكُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُونَ.

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَاعَلَّمْتَنَا، إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ. رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي، وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي، يَفْقَهُوا قَوْلِي. رَبِّ يَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَيْرِ، وَبِكَ نَسْتَعِيْنُ يَافَتَّاحُ. رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا. اَللّٰهُمَّ فَقِّهْنَا فِي الدِّينِ، وَعَلِّمْنَا تَأْوِيلَ الْأَحَادِيثِ. اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَايَنْفَعُ، وَقَلْبٍ لَايَخْشَعُ، وَنَفْسٍ لَاتَشْبَعُ، وَدُعاءٍ لَايُسْمَعُ، وَمِنْ هٰؤُلاءِ الْأَرْبَعِ. اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَعِيْنُكَ عَلَى الدَّرْسِ وَالتَّدْرِيسِ.

حُبُّهُ الزَّائِدُ لِلْعُلَمَاءِ وَالشُّيُوْخِ وَذِكْرُهُ لَهُمْ

وكان يَقُصُّ عَلَى الطُّلابِ خِلَالَ الدَّرس قِصَصَ العلماءِ السهارنفوريين والديوبنديين (وهو يحبهم حُبًّا جَمًّا)، سيما شيخَه الكبيرَ شيخ الحديث محمد زكريا الكاندهلوي-رحمه الله- الذي كانَ يذكُره بَينَ آوِنَةٍ وأُخرى؛ حتى إذا أَخذ في ذكره، ذَكَرَه ذكرَ العاشق الهائم المجنون للمعشوق وبلادِهِ، وقرُاها -أَي: قُرَى بِلَادِهِ- وبُنيانِهاوبيوتِها، وشوارعِها وطُرُقِها، وأَزِقَّتِها وجدرانِها؛ بَل كلِّ صغيرِها وكبيرِها، فلايدعُ من ذلك شيئًا. حينَما خَاضَ فِي ذِكرِهِ أَوقَفْنا -نحنُ الطلبةَ-

أَقلامَنا، ووجَّهنا أَنظارَنا وأَفكارَنا وأَذهانَنَا كلَّها إلى وجه الشيخ لا غيرَ؛ لِمَا قَدْ علمنا أَنه -حينَما جعل يَأْخُذُ فِي ذِكرِ الشيخ وقريتِه- يسرُد كلامَه ولا يُمْسِكُ عنه؛ حتى يُدَقَّ الجرسُ عِندَ انتهاءِ الحصَّةِ، فينتهي كلامُه وقد لمَسْنَا في أَنفُسِنا أَنه قدْ تَرَكَ في قلوبِنا شيئًا من شرَرِ حبِّ شيخه ومرشده: الشيخ محمد زكريا رحمه اللهُ.

وكان الأُستاذ -خلالَ الدرس- يُمازح الطلاب حينًا، ويُطرفُهم مرةً، ولا يخرج مع ذلك عن رَزَانَتِه. وكان لا يغضبهم أَبدا، إلا إذا مَلَأَ كأْسَ الصبر والحلم إلى الغايةِ القُصوىٰ أَحدٌ من الطلاب، فيُعَاتِبه؛ ويظهر أَثَرُ العتابِ في كلامه بحيث إنه يُخاطِبُ ذلك الطالبَ اللئيمَ بِلَفْظِ ''تو'' رغمَ أَنه كان تعوَّد على خطابِ أَيِّ طالبٍ يُخَاطِبهُ بلفظِ ''آپ'' احترامًا وتكريمًا لضيوف الرسول ﷺ.

كان الأُستاذ محبوبًا لدى زملائِه وطلابه، محافظًا على وقته، عطوفًا على تلاميذه، ملتزما بأُصولِ مدرسته، وحقًّا كان الأُستاذ من العلماء الجهابِذَةِ القليلينَ أَنجَبهم التاريخُ الإِسلاميُّ في العصورِ المتأَخِّرة.

مِنْ طَرَائِفِهِ

وكان الأُستاذ ظريفَ الطبع، لذلك كان يُطرف أَحيانا بِطرائفَ علميةً، ولطائفَ مضحكة، يضحكُ بها ويُضحكُ الطلابَ؛ ولكنه إذا ضحك بنفسه، لا يُنسى منظره الجميل، وكان يفعل هذا لتنبيه

الطُّلابِ على غفلتهم بزهرة تبَسُّمِهِ.

أَنا أَتذكَّرُ جيدًا أَن الأُستاذ ذاتَ يوم ذَكَرَ لَنا قصة، وهِيَ أَن عدةَ طلابٍ أَبطَؤوْا في الحُضُورِ إلى الجامعةِ ذَاتَ ليلةٍ، فإذا أَتَوْا بوابةَ الجامعة مُبالغين في التأَخُّرِ، أَوقَفَهمُ الحاجبُ عِندَ البوَّابةِ -وكان بليدًا جاهلا غافلًا- وسأَلهم عن أَسماءهم، فقال: "أَنبئوني بأَسمائكم! أُخْبِرْبِكم المديرَ". فأَخبرَه كُلٌّ منهم باسمٍ من أَسماء الكتب الستة، مثلًا قال أَحدُهم: اِسمي "بخاري"، وقال الآخر: اسمي "مسلم"، فكتَب الحارسُ أَسماءهم في ورقة. فلمَّا أَصبح أَتَى المديرَ في مكتبه، وقدَّمَ إليه تلك الورقةَ، وقال: "هٰؤلاء الطلبة قد غابوا بالأَمس؛ فلذا تأَخروا البارحةَ في القُدُوم إلى الجامعةِ". فإذا رأَى المديرُ أَسماءهم وقرأَها، تعجَّب وتحيَّر ثُمَّ ضحِك ضحكًا؛ حتى بدت نواجذُه، ولم يقدر علَى شيءٍ أَيْ ولم يستطع أن يصنع شيئا مع الطلاب المُتَّهَمينَ؛ لِعَدمِ تمَكُّنهِ مِنْ معرِفَتِهمْ مَعرفةً حَقِيقيَّةً.

ومنها مَا قال في حلقة الدرس يومًا: "تكلَّمُوا فيما بينكم باللغة العربية ولو مُتَقَطِّعَةً مُتَكَسِّرَةً"، ثم يقول: "أَيها الطلابُ! إذا سافرتم إلى المملكة العربية لِزيارة الحرمَين الشَّرِيفَينِ (أَيْ للحج أَوِ العمرة) فلن تجدوا هناك على دُكانٍ مَّا لوحةً بالأُردِيةِ أَوِ الغجراتية؛ بل كُلُّ شيءٍ هناك باللغة العربية القُحَّةِ". ثم يَذكُرُ لَنا جُمَلًا عربيةً يحفظُها

من اللوحات المختلفة هناك، مثلًا: ''الثياب المجهَّزة للرجال والنساء'' و''مَمْنُوْعُ وقوف السيارات هِنا'' وغيرها من الجمل الكثيرة.

خَدَمَاتُهُ الْأُخْرَىٰ

إِنَّ خدماته كانت مُنبسطةً وَمُحتويةً على نحوِ خمسةِ عُقودٍ، لاأَستطيعُ أَن أُحصيَها كُلَّها في هذه السطور المعدودة؛ ولكن أَرى أَن أَذكرَ منها بعضًا مِمَّا سيظَلُّ مُسجَّلًا مُتلأْلِأً في أَوراق التاريخ.

إِن الأُستاذ الفقيد الرحيل هُو الذي دَعَمَ مَجَالَ الدعوة والتبليغ في الجامعة، فازدهرَ وانتعشَ بجُهودِه المُكَثَّفَةِ وَمساعِيهِ الجميلةِ وصَارَ على الحَالِ الذي نراه اليومَ. يُذْكَرُ أَنه لمَّا بَدأَ جهودَه في هذا المجالِ بعد ما وطئَتْ الجامعةَ قدمَاه، لَمْ يكُنْ لِعَمَلِ الدَّعوةِ والتبليغِ نشاطاتٌ، فبذلَ كلَّ ما في وُسعه من الطاقات والمواهبِ في ترويجِ هذه السلسلة في الجامعة؛ حتى أَن صارتْ مساعيه مُكَلَّلَةً بالنجاح والإِثمار.

والجدير بالذكر أَنه كان يُحب هذه الدعوةَ والتبليغ مُنذُ أَيام دِراستِه، فلذا كان في زمن طلبِ العلم إِذا تعطَّلت الجامعة في شعبان المعظم من كل سنةٍ، خرج في الجماعة للدعوة والتبليغ لِمُدَّة أَربعين يوما، وبعد أَنْ أَكملَ هذه المدةَ انطلقَ إِلى شيخه لأَجلِ الاعتكاف بسهارنفور. ومَا زَالَ دَأْبُه هذا حتى بعدَ ما عُيِّنَ أُستاذًا. فكان يخرج هُو بنفسه بعِدَّة من الطلاب -المنتمين إِلى الدعوة والتبليغ- إِلى قرية قرية

في كلِّ أُسبوعٍ. فرُبما يخرج معهم إلى قرية "ويسما"، وعند الرجوع ليس معه نفقةٌ وأُجرة للركوب، فيأْتي الجامعةَ -بعد ما أَتمَّ فُرصةَ أَربعٍ وعشرين ساعةً- بِهم يحمِلُ أَمتِعَةَ الجماعة على عاتقِه ماشيًا.

ومن خدماته نقلُه الفتاوىٰ الغجراتيةَ (التي كتبها المفتى إسماعيل بسم الله رحمه الله تعالى رحمة واسعة) إلى الأُردية من السجلاتِ القديمة والدفاترِ البالية بغَاية جَهْدٍ وَمشقة (كما اعترف به أُستاذُنا المحترم المفتى عباس بسم الله أَدامَ الله فيوضهم علينا)، وقام بهذا العمل نحوَ سنتين بعْدَ قُدومهِ الجامعةَ، وأَدى هذه المسئوليةَ أَحسنَ تأْديةٍ. وكذلك تولَّى إِدارةَ خطةِ التدريس نيابةً عن الشيخ المفتي أَحمد الخانفوري -حفظه الله ورعاه- ثم بعد ما وُلِّي الشيخُ المفتي أَحمد الخانفوري رئاسةَ الإِفتاء والقضاء، وُلِّيَ مسئوليةَ خطةِ التدريس فَقامَ بِها عِدةَ سنواتٍ أَحسن قِيامٍ. وأَيضا لم يَخْفَ على أَي طالب من طلاب الجامعةِ دَوْرُه الذي قامَ به في نظام قاعة الامتحانات بالجامعة، قد سجَّله تاريخُ الجامعةِ في بطونِ أَوراقِها. وغيرِ ذلك من الخدمات الأُخرى الكثيرة الجليلة الفائقة التي يطولُ بِذِكرِهَا الكلامُ.

حُلْيَتُهُ الْمُبَارَكَةِ وَأَوْصَافُهُ الْعَالِيَةُ وَخِصَالُهُ الْحَمِيْدَةُ

كَانَ الشَّيْخُ فَخْمًا مُفَخَّمًا، طَوِيلَ الْقَامَةِ، كَبِيرَ الْجُثَّةِ، ضَخْمَ الْكَرَادِيسِ، حَسَنَ الْجِسْمِ، عَظِيمَ الْهَامَةِ، لَيْسَ بِالْمُكَلْثَمِ؛ وَلَكِنْ فِي

وَجْهِهِ تَدْوِيرٌ، أَسْمَرَ اللَّوْنِ، مُشْرَبَ الْوَجْهِ، نَاتِئَ الْجَبْهَةِ وَالْأَنْفِ، وَاسِعَ الْجَبِينِ، كَثَّ اللِّحْيَةِ الْعَطِرَةِ، رَحْبَ الرَّاحَةِ، شَثْنَ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ، جَلِيلَ الْمُشَاشِ وَالْكَتِدِ، عَرِيضَ الصَّدْرِ، بُعَيْدَ مَا بَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ، أَشْعَرَ الذِّرَاعَيْنِ، بَاسِمَ الْوَجْهِ، يَتَلَأْلَأُ وَجْهُهُ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، أَجْوَدَ النَّاسِ صَدْرًا، وَأَصْدَقَهُمْ لَهْجَةً، وَأَلْيَنَهُمْ عَرِيكَةً، وَأَكْرَمَهُمْ عِشْرَةً؛ إِذَا مَشَى تَمَايَلَ فِي مِشْيَتِهِ، وَإِذَا الْتَفَتَ الْتَفَتَ مَعًا. مَنْ رَاٰهُ بَدِيهَةً هَابَهُ، وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً أَحَبَّهُ.

كانت هويةُ الأُستاذ مجموعةَ الخلال الحميدة والشيم المرضية مِنَ التزهد في الدنيا، والقناعة بقليلها، والسخاء، والجود، ومكارم الأخلاق، وطلاقة الوجه، والحلم والصبر وملازمة الورع والخشوع والسكينة والوقار. وكانَ يقُولُ: "لا تَعُدُّوا ما عندكم من الأَموال والروبياتِ؛ فإنه يمحق البركةَ ويُذهبُها".

ومن ميزاته الخاصة أَنه كان محافظا على الصف الأَول في الصلواتِ كلها مدى الحياة، وأَنه يصل في كل صلاةٍ إلى المسجد قبل وقتها بِكثيرٍ؛ ولذلك إذا تأَخَّر -في يومٍ من الأَيامِ- في وُصوله إليه لأَيِّ وجهٍ، حَمْلَقَ كُلٌّ إلى باب المسجد؛ فإذا هُوَ مقبلٌ بسُرعةٍ مُتكئًا على خادمٍ له، ثم وصل الصفَّ ودخل في الصلاة. وكان لسانُه لا يزال رَطْبًا من ذكر الله ورسوله، أَينما كان وحينما كان. وأَنه يهتم كثيرًا بالأَدعية المَأْثورة

في كل أَحوالٍ متواردةٍ.

وكان الأُستاذ - رحمه الله - يَحْمِلُ بَيْنَ جَنْبَيْهِ قَلْبًا رَقِيْقًا، ولا سيما بالنسبة لِطلاب العلم وضُيوفِ رسولِ الله ﷺ، ولا يرى رأْيَ مَن يسلك لإِصلاحهم وتأْديبِهم مسلكَ الضرب وهتكِ الحرمة. فإذا كُنَّا في الصف السادس أَو الخامس ذكر لَنا ما شاهده في هذَا البابِ، فقالَ:

"ذاتَ يومٍ كُنتُ أَجِيءُ إِلى الفصل على حسب العادة، فوقعَ نظري على المدير الأَسبق أَنه يضرب طالبًا ضربا شديدا جَاعِلًا لَه كَهَيْئَةِ الدِّيْكِ، فإِذا أَتذكرُ ذلكَ الْمَنظَرَ اليومَ، تَتَغَرْغَرُ عيناي بالدموع وأَتفكر: لِمَاذا يضرب ذلك الطالبَ المسكينَ!!؟" ثم يقول بقلبه الحزين: "اِعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِذا وُلِّيتُم مَنْصِبًا، فلا تُعَسِّروا؛ لأَنه يورثُ التَّنفيرَ، بَلْ علِّموا الطلابَ وأَنشِئُوهُم بالْمَحبة والعطوفة، فمن ظَلَمَهم رأَى جزاءَه في هذه الدنيا، وهُو يتململُ تململًا على فراشه، ولا يأْتِيه الموت".

ثمَّ يقولُ: "لقد رأَينا مَن يفعل هٰكذا، ولا أَزالُ أَنظُر حَتَّى الآن".

ومن أَهمِّ ميزاته حافظتُه القويةُ المستوعِبة التي تُمكِّنه على استحضار العلوم والمعارف مع كلياتها وجزئياتها والقصص الماضية والتاريخ الإسلامي، لِذا كان الشيخ يُمَثِّلُ خزينةَ تاريخ الجامعة. ويدلُّ على ما قلناه: أَنه كان يحفظ متونا وعبارات طويلةً من الكتب الفقهية واللغوية، ويقرأُها علينا خلالَ الدرس. وأَن المسائل الخلافية مع

أَدلتها كانت مستحضرةً عنده في كل حين وآنٍ؛ كَأَنها موضوعةٌ على لسانه، وموجودة في كتاب مفتوح أَمامَه.

مِنْ نَصَائِحِهِ الذَّهَبِيَّةِ الثَّمَنِيَّةِ

وكان الأُستاذ -رحمه الله- لا يُدرسُنَا -الطلابَ- الكتبَ فقط، ولا يملأُ أَذهَانَنا بأَلفاظها فحسبُ؛ بل يُسدي إِلينا غِبًّا بَعدَ غِبٍّ نصائحَ غاليةً قيمةً، خَرَجَتْ من تجاربه الطويلة وأَفكاره العميقة، قد أَثبتَ وأَحصى بعضُ زملائي أَكثرَها، أُرىٰ أَن أَنقُلَ أَمامك بعضَها؛ لأَن الإحاطةَ بِكُلِّ ما سجَّله لا يمكنُ لِي في هٰذه السطورِ المعدودة:

(١) إِذَا ذَهَبْتَ بِشَيءٍ إلى حَيثُ لَمْ يُوجَدْ، كانَ مشكورًا ومحسوبًا له، فالتَّواضُع لم يوجد عند ذي الجلال والإكرام، فإذا أَتيتَه به، فإِنَ اللهَ شاكرٌ عَلِيمٌ.

(٢) إذا صبرتم على ما أُوذِيتُم، تكونوا أَبدالا؛ فاصبروا واعفوا لِلّٰهِ، ولا تُعاقِبوا. ثم قرأَ: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾

(٣) لو كُنتم في كُتَّابٍ أَو مدرسة، فظُلِمْتُمْ وجُعِلْتُمْ في التخلُّف والهُبوطِ، فلاتُنازِعُوا، وتذَكَّرُوْا قَولَ رسولِ الله ﷺ: "إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدِي أَثَرَةً وَأُمُورًا تُنْكِرُونَهَا. قَالُوا: فَمَا تأْمُرُنَا يَا رَسُولَ اللهِ ﷺ؟ قَالَ: اَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ، وَسَلُوا اللهَ حَقَّكُمْ". [رواه البخاري ومسلم عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ]

(٤) الشيئانِ لا يجتمعانِ أَصلًا: حُصولُ العلمِ وارتكاب المعاصي والذنوب؛ فإن العلمَ نورٌ، والمعصية ظُلمة، فلا تُطفِئُوا نورَ العلم بظُلْمَةِ المعصية.

(٥) نحن إنَّمَا نتعلَّمُ الأَحاديث؛ لِنعمَلَ بِما أَتَانَا من سُنَنِ رسولِ الله ﷺ.

(٦) إنَّ الإِنسان يُفْتَن إِذا أَكثَر من الاختلاطِ بالناس والعوام.

(٧) لَا ينبغي أَن يكونَ الطالبُ حُرًّا في الفِكر والرأْي؛ فإنما هي من الشيطانِ الرجيم، فاجتَنِبوها وبَايِعوا على يد مُرشدٍ ومُصلح، واتَّبِعوه في كل أَمر.

(٨) بلِّغُوا الناسَ عن رسولِ الله ﷺ، واتَّقوا الله أَينما كُنتم وحينما كُنتمْ.

(٩) ينبغي لِمَن ينتسبُ إلى الدَّعوة والإرشاد أَن يُيَسِّرَ في العمل؛ فإنما التيسيرُ هُو الأَصلُ والسِّرُ في النجاح والفلاح، وهذا هُو المنشود من قول النبي ﷺ: "إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ، وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ".

(١٠) يقولُ العلماءُ والصوفياء: مَا نِلْنَا من الفضائلِ والمحاسنِ، فهُو بِبَرَكَةِ التهجدِ واتباعِ الرسول ﷺ.

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾

دَمْعَاتُ الْقَلْبِ الْحَزِيْنِ عَلَى الْفَقِيْدِ الرَّحِيْلِ

كان الشيخ في آخر عمره غيرَ موفورِ الصحة وسليم الجسد، وإِن كان يعاني من شدة الأَلَم بما اعتراه الضعف وبِمَا حلَّ به الوهنُ في سائرِ الجسدِ؛ ولكنه كان لا يستسلمُ أَمامَ وجعه وأَلَمِه واضمحلالهِ؛ بل

ظلَّ عَكُوْفًا على وظيفة التدريس وتربية الطلاب، ووقَفَ حياته كلَّها من أَجلِ تأْهِيلهم.

بينَما كان عقربُ الساعة إلى الرابعة مِنَ الليلِ، إذا استيقظتْ زوجة الأُستاذ وذهبَت إلى حجرةٍ كانتْ فيه ساعة رقميةٌ؛ لتعرِفَ الوقتَ؛ فإنها تُريد صلاةَ العِشاء (قد فاتتْها في أَولِ وقتٍ لعذرٍ حَالَ دُونَها) والتهجدِ، فلمَّا عادت إلى حجرتها، قال الأُستاذ لها: أَينَ كُنْتِ ذهبتِ؟ فذكرتْ له ما سنح لها من الحاجة. فقال: لمَ حمَلتِ المشقة؟ لَوْ سأَلتِنِي، أَخبرتُكِ! فإني كُنتُ مُستيقِظًا. ثمَّ قالت للشيخ بعد الفراغ من الصلاة؛ لِمَا رأَتْ به من شدةِ الْمَرضِ: آتِيكَ بماءِ زمزم؟ فذهبت وأَتَتْه بِه، فإذَا هُوَ قد استأْثَرَتْهُ رحمةُ اللهِ تعالىٰ. إنا لِله وإِنا إِليه راجعون.

لمَّا أَقرعَ هذا الخبرُ العجيب أَستارَ آذانِنا -وقد كُنتُ مُستعِدًا للذِّهابِ إلى المسجد-، جَفَّ لُعابُنا في فمِنا، واستطارَتْ صُدوعُ كبِدِنا على حرمانِنا أَبَانَا الروحانيَّ، فكانت الدموعُ منسكبةً لا ترقَأُ، والقلوبُ مقلقِلةً لا تَهدأُ، والجلودُ مقشعِرةً لا تسكنُ، والفرائصُ مرتعدةً على حادثةٍ، أَطارَتِ الكرىٰ، وأَذْهَلَتِ النفوس، وعطَّلَتِ الأَذهان والأَدمغة، كدَرَت صفو عيشِنا، وانعدمتْ ربيع حياتِنا، فأَصبحنا أَمواتا بين الأَحياء، وأَيتامًا بين الآباء، وغرباءَ بين الأَخِلاء.

سلامُ الله عليك يا أُستاذي! ورحمة الله عليك أَيها الفقيد

الراحل! ياشيخَنا الكريم! إِن قلوبَنا لتُعتصَر أَلَمًا، وأَكبادَنا لَتملَأُ أَسًى وحزنًا من رحلتِك إلى الرفيق الأَعلى. أَين نجدُ الآنَ مثلَك مَن أَفنى شبابه ليلة ليلةً في مطالعة الكتب! ومَن يملأُ صدورَنا بِدُرَرِ العلم والعرفان! ومن يدعو لنا ليلًا مُجَافيًا جنوبَه عن مضجعِه! ومن وقفَ حياته في تربية الطلاب وتزكيتِهم!

يَا مَن أَنفقَ حياتَه لِتَطوير هذه الجامعة! وَيَا مَنْ قضى عيشَه لتحسين نظامِ قاعة الاحتفالات! ويَا مَن أَروىٰ مِن نبعه غلتَنا! ويا مَنْ كان في تضرعه إلى الله حظُّنا! ويامَن كان حُبُّه لنا حبَّ آبائِنا! ويا مَن كانت شفقته لنا شفقةَ أُمهاتِنا! ويامَن كانَ شمسَ زمانِنا وقمرَ عصرِنا! واللهِ! إنَّ في حياتك كانت لنا عِظاتٌ؛ بل شخصيتك كانت أُسوةً لنا، وهويتك كانت قدوةً لنا؛ ولكن عارٌ علينا، وأَسفٌ علينا أَنْ لَم نقتبسْ من نورِ معرفتِك، ولم نتأَس بأُسوتِك ياحبذا!

لو كنا نعرف مبلغَ عظَمتِك قبل ارتحالك، وارتباطَ علاقاتِك مع ربِّك، وفضْلَ هدايتِك، وحُبَّ قلبك، وأَنوارَ معرفتِك! ويالَيتنا لَو كُنا استسمنَّا قيمتك، واستعزَرنا ديمتَك، لَفُزنا فوزًا عظيمًا، وبلغنا ذرى مجدٍ كنتَ تتمنّٰى لنا في قرارة نفسك إلى أَن أَتاك اليقين.

والله! إن وفاتَك خسارةٌ لنا ولجميع أَفرادِ الأُمة الإسلامية، فنحن مدينون لك يا أُستاذنا الرحيل! بل أَرواحُنا فداءٌ لكَ ياشيخنا

الكريم! واللهِ إن الحزنَ والغم قد سَلَبَا الفرحَ والسرورَ أَفْوَاهَنا، ونحن لانزالُ في حنينٍ إلى لقاءك الكريم، وأَن أُمنيتنا هذه ستتحقق إن شاء الله تعالىٰ في النعيم.

أَيها الأُستاذ الراحل! نحن نُخلص الدعاءَ من الله الرؤوف الرحيم لك أَيها الأُستاذ الفقيدُ! خاصةً ولنا عامةً أَن يعاملَنا مولانا اللطيفُ بما هو أَهله؛ فإنه أَهل التقوى وأَهل المغفرة. ونحن نرجو من الله قَوْلَهُ لَكَ: ﴿يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ۝٢٧ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝٢٨ فَٱدْخُلِى فِى عِبَٰدِى ۝٢٩ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى ۝٣٠﴾.

إِخواننا في الله! إِن الشيخ قد شرِب كأْسَ الموت، وانتقل إلى ذمة الله، ولقي الرحمٰنَ، وصارت عقباه صالحةً، وخلَّف بين أَيدينا مآثره الجليلة، وأُسوتَه العظيمة، ومعاشرته الحسنةَ، وأَحرزَ قصباتِ السبق في حياة الدنيا والآخرة بالتفوق والامتياز بِبَذْلِ مَا في قُدْرَتِه من النضالات العالية وخَدماته النيرة.

والمنشودُ من معالجة ذكريات الشيخ إختيارُ طريقِ الْمَجْدِ والْعَظَمَةِ التي سلكها، ونالَ بِها رضوانا من الله تعالىٰ، لِذلك أُصغوا أَذانَكم: إن روحَ الشيخ تنادينا صارخةً: "يا أَفلاذَ كبدي! اعلموا أَن الحياة الدنيا ليست إلا لُمَاظةً، والموت له حقيقة سرمدية؛ لذا لاتمدُّوا عيونَكم إلى حطام الدنيا وزخارفها، واضرِبوا كشحا عن ملذات

الدنيا ورغباتها، واستنفدوا الوسعَ في ذكر الله وحب رسوله، ولا تَنسوا أَنكم ورَثَةُ الأَنبياء؛ فعليكم أَن تجعلوا حياةَ الرسول ﷺ زينةَ حياتِكم، وتتأَسوا بأُسوته ﷺ، وتخلقوا بحُسنِ أَخْلَاقِهِ ﷺ، واخدِموا الإسلامَ والمسلمينَ متحلين أَنفسَكم بعلوم القرآن والحديث مادام وجودُكم تحتَ أَديم السماء".

خِتَامًا أَقولُ: "إِنَّ الْعَيْنَ لَتَدْمَعُ، وَالْقَلْبَ لَيَحْزَنُ، وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يُرْضِي رَبَّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ -يَا مَنْ أَقُوْلُ فِيهِ: ﴿يَٰٓأَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ﴾- لَمَحْزُونُونَ".

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهِ، وأَهْلًا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهِ، وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ، وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ.

قالهُ بِلِسَانِه وحرَّرَه بِبَنَانِه:

محمد أُسامه بن مظهر الجاركندي

المتعلم: في الصف السابع النهائي المسمّٰى بـ "دورة الحديث"

تحريرًا: في الساعة الثانية عشرة ليلة يومِ الثلاثاء

بتاريخ: ۲۳ جمادى الأُولى عام ۱٤۳۸ھ

از: حضرت مفتی طاہر صاحب سورتی مدظلّہ

یوسف! تمھارے غم میں ہر اِک سوگوار ہے
یہ صحن جامعہ کا بھی اَشک بار ہے
اُن کے وجود سے ہمیں جو لطف واُنس تھا
بلبل چمن میں آج ہر اِک زار زار ہے
داغِ مفارقت دیا، سوئے جِناں چلے
ماتم کناں یہاں پہ ہر اِک برگ و بار ہے
احمد یہ تینوں آپ سے مسرور تھے بہت
لیکن وہ آج دیکھیے کیا بے قرار ہے
قرآں، حدیث، فقہ ونحو؛ سب کچھ دیا اسے
طاؔہر تمھارے جانے سے بے اختیار ہے